Regd. L. No.7243

Phone: 880800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

فروری 1983

اس پرچہ میں

نظریہ ضرورت

شائع کردہ: ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی - گلبرگ - ۲ - لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوع اسلام لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلی فون	بدل اشتراک
۳	۸۸۰۸۰۰	سالانہ
تین روپے	خط و کتابت ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور	پاکستان -/۳۶ روپے غیر ممالک -/۸۶ روپے
شمارہ ۲	فروری ۱۹۸۳ء	جلد ۳۶

فہرست

۱۔ لمعات ۔ تنظیم ضرورت — — — — — — — ۲
۲۔ بھولی ہوئی کہانیاں! — — — — — — — ۱۳
۳۔ سلیم کے نام — — — — — — (محترم پرویز صاحب) ۲۵
۴۔ حقائق و عبر :۔ (۱) یہ توہم پرستیاں کب ختم ہوں گی؟ — — — ۳۳
(۲) کوڑوں کی سزا انگریز کی ورثہ ہے!
(۳) قوت کا آخری علاج قوت ہے۔
(۴) زہر کھلا کر آمدنی حاصل کرنا۔
(۵) کاش ہم قیدی ہوتے!
۵۔ قرآن العظیم — — — — — — (محترم پرویز صاحب) ۴۱
۶۔ بقیہ بھولی ہوئی کہانیاں! — — — — — — — ۶۲
۷۔ قرآنی درس کے اعلانات — — — — — — — ۶۴

ایڈیٹر: محمد خلیل ۔ ناشر: شیخ عبدالحمید ۔ مقام اشاعت: ۲۵/بی گلبرگ ۲ ۔ لاہور ۔ مطبوعہ: اشرف پرنٹنگ پریس ۷ ایبک روڈ لاہور۔

باسمہٖ تعالیٰ

لمعات

نظریۂ ضرورت

اقبالؒ نے کہا تھا

میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہو گا　　مسائلِ نظری میں اُلجھ گیا ہے خطیب

یہ آج کی بات نہیں۔ ہمارے ہاں ہزار سال سے یہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اور جہاں بھی ملوکیت ہو گی وہاں ایسا ہی ہو گا۔ ملوکیت میں قوم کو مملکت کے تعمیری امور میں دخیل نہیں ہونے دیا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نظری مباحث میں اُلجھ کر اس خوش فہمی میں مبتلا رہتی ہے کہ ہم بڑے اہم امور سرانجام دے رہے ہیں۔ پنجابی زبان میں ایک محاورہ ہے —— وِہلی جِنّی اُن ویلے —— اب تو شاید ایسا نہ ہو۔ کچھ عرصہ پہلے تک دیہات میں ہر گھر میں چھوٹا سا بیلن ہوتا تھا۔ گھر کی خواتین فرصت کے وقت اس میں کپاس بیلا کرتی تھیں۔ یعنی کپاس سے بنولے الگ کر کے روئی تیار کرتی تھیں۔ یہ تعمیری کام تھا۔ (محاورہ میں کہا گیا ہے کہ) اس بیکار عورت کو دیکھئے۔ وہ کپاس نہیں، اُون بیل رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنے میں وقت بھی صرف ہو گا اور توانائی بھی لیکن نتیجہ کچھ نہیں برآمد ہو گا۔ ہماری قوم صدیوں سے اُون بیلتی چلی آ رہی ہے۔ یہ اس لئے کہ ملوکیت، ساری "کپاس" اپنی فیکٹریوں میں بھیج دیتی ہے۔ یہ بیچاری بیکار بیٹھی اُون نہ بیلے تو کیا کرے؟ آپ اپنی تاریخ پر غور کریں۔ ملوکیت کے دورِ اوّل سے یہ جو نظری مسائل کے حل کرنے میں اُلجھی ہے، آج تک اُنہی میں اُلجھی چلی آ رہی ہے —— قرآن حادث ہے یا قدیم (اس بحث میں جس قدر خون بہا تھا، بغداد کی گلیوں کی نالیاں اس کی شاہد تھیں) صفاتِ خداوندی، خدا سے جدا ہیں یا عینِ ذات ہیں۔ حضور نبی اکرمؐ کا سایہ تھا یا نہیں حضورؐ کی معراج جسمانی تھی یا روحانی۔ حضورؐ بشر تھے یا نور۔ عرشِ خداوندی کی لمبائی چوڑائی کتنی ہے۔ حوضِ کوثر کا طول۔ عرض اور گہرائی کس قدر ہے۔ اس کے آبخوروں کی تعداد کتنی ہے۔ مرنے کے بعد روحیں کہاں رہتی ہیں۔ کوّا حلال ہے یا حرام۔ مچھلی کو ذبح کیا جائے گا یا نہیں۔ یا نشانہ ہاتھ خلف امام۔ آمین بالجہر یا خفی۔ رفع یدین۔ وغیرہ۔ یہ تو ہم نے چند ایک مثالیں پیش کی ہیں۔ اگر آپ تفصیل چاہتے ہوں تو فقہ کی کتابوں

یہ ان مسائل کو دیکھئے جن پر "لَوْ فُرِضْنَا" کے تحت بحث ہوتی ہے۔ اس "فرض کیجئے" کے ضمن میں ایسے ایسے واقعات سے بحث ہوتی ہے جو نہ کبھی وقوع میں آئے ہوں نہ ہی ان کے وقوع میں آنے کا امکان ہو۔ آپ ہمارے ہزار برس پر پھیلے ہوئے مذہبی لٹریچر کے انبار کو دیکھئے۔ اس میں زندگی کے عملی مسائل کے متعلق بہت کم بحثیں ملیں گی۔ سارا لٹریچر نظری مسائل پر مشتمل ملے گا۔ ملوکیت اسی میں اپنی منفعت اور تحفظ دیکھتی ہے۔ اس لئے وہ نہ صرف اس سے صرفِ نظر کرتی ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتی ہے۔

آج کل ہمارے ہاں اسی قسم کی ایک نظری بحث اس عنوان کے تحت چل رہی ہے کہ "نظریۂ ضرورت" اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔ یعنی یہ تو ابھی تک یہاں طے نہیں پایا کہ کسی بات کے اسلامی قرار پانے کا معیار کیا ہے۔ اور کیفیت یہ ہے کہ کسی کو چھینک بھی آ جائے تو اس کے اسلامی اور غیر اسلامی ہونے کی بحث چھڑ جاتی ہے۔ اور جب اس قسم کی بحثیں ملک گیر ہو جاتی ہیں تو طلوعِ اسلام میں بھی استفسارات کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ یہ سطور انہی استفسارات کے حوالے سے رقم کی جا رہی ہیں۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ "نظریۂ ضرورت" کا مفہوم کیا ہے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ حق اور باطل، جائز اور ناجائز کے کوئی ایسے حدود نہیں جنہیں کسی حالت میں بھی توڑا نہ جا سکے۔ مصلحت کا تقاضا ہو تو ناجائز بھی جائز قرار پا سکتا ہے۔ یہ نظریہ سیکولرازم کا ہے جس کا بانی اٹلی کا مشہور سیاست دان میکیاولی تھا۔ اس کے نزدیک اخلاق۔ اصول۔ اقدار کی کچھ بھی حیثیت نہیں۔ اپنے (یا مملکت) کے مفاد کی خاطر جو اقدام بھی کیا جائے جائز ہے۔ میکیاولی سیاست کا نامور علمبردار (RUMELIN) لکھتا ہے:-

> مملکت کا بنیادی فریضہ اپنے مفاد کا تحفظ ہے اور اپنی قوت کی نشوونما ..... مملکت کا استحکام ہر اخلاقی تقاضے پر مقدم ہے اس لئے اس کے لئے ہر قربانی جائز۔ (انسان نے کیا سوچا۔ صہ ۲۳۳)۔

اس کے ایک دوسرے مشہور مؤید فریڈرک دی گریٹ کے یہ الفاظ ایوانات سیاست میں گونجتے رہتے ہیں کہ:-

> کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ تم اپنے عوائم کو چھپاؤ اور اپنے کیریکٹر کو ہمیشہ زیرِ نقاب رکھو ....
> صحیح حکمتِ عملی یہ نہیں کہ پہلے سے متعین کر لیا جائے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ حکمتِ عملی یہ ہے کہ حسبِ موقع جو صورت اپنے فائدے کی نظر آئے اختیار کر لی جائے۔ (ایضاً صہ ۲۳۳)۔

خود میکیاولی کے الفاظ ہیں:-

> بادشاہ کے لئے صفتِ روباہی نہایت ضروری ہے تاکہ وہ دجل و فریب کے جال بچھا سکے۔ اس کے ساتھ ہی شیری بھی تاکہ وہ بھیڑیوں کو خائف رکھ سکے۔ اس لئے عقلمند بادشاہ وہ ہے کہ جب وہ دیکھے کہ کوئی عہد یا معاہدہ اس کے اپنے مفاد کے خلاف جاتا ہے۔ یا جن وجوہات کے پیشِ نظر وہ معاہدہ کیا تھا وہ باقی نہیں رہیں، تو اسے بلا تامل توڑ ڈالے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس قسم کی عہد شکنی کے لئے نہایت نگہ فریب دلائل بہم پہنچائے۔

(THE PRINCE - CHAPTER 18TH) (انسان صہ ۲۳۴)

آگے چل کر وہ کہتا ہے:-

جو بادشاہ اپنے پاؤں مستحکم رکھنا چاہتا ہے اس کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ بدی کس طرح کی جاتی ہے اور اس کے لئے سب سے زیادہ موزوں وقت کون سا ہے۔ اس میں خوبیوں کا ہونا ضروری نہیں، البتہ یہ ضروری ہے کہ بظاہر معلوم ہو کہ اس میں خوبیاں موجود ہیں۔ بظاہر ایسا دکھائی دے کہ وہ بڑا رحم دل، وفا شعار، نیک اطوار، مذہب پرست، صداقت پسند ہے۔ اس میں چنداں مضائقہ نہیں کہ اس میں ان میں سے کوئی خوبی سچ مچ پیدا ہو جائے لیکن یہ نہایت ضروری ہے کہ اس کے دل کی حالت ہمیشہ ایسی رہے کہ جونہی وہ دیکھے کہ مصلحتِ وقت کا تقاضا ہے کہ اس خوبی کو یکسر الگ کر دیا جائے تو وہ بلا تامل و توقف اس کے خلاف عمل کر سکے۔ (ایضاً باب ۱۸ بحوالہ "انسان نے کیا سوچا" صفحہ ۲۳۲-۲۳۳)

یہ ہے وہ نظریہ ضرورت جس پر سیکولرازم کی عمارت استوار ہے اور جو آج کل اقوامِ عالم کا سیاسی مسلک ہے (اور جس کی وجہ سے دنیا جہنم بن رہی ہے)۔ اس نظریہ کے مفہوم کے متعلق کسی فلسفیانہ بحث کی ضرورت نہیں۔ یہ صبح سے شام تک بیسیوں مرتبہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ جب آپ کسی کو کہتے ہیں کہ تم نے جھوٹ کیوں بولا؟ تو وہ کھٹ سے جواب میں کہہ دیتا ہے کہ "مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں جھوٹ بولتا" یعنی وہ سچا اس وقت تک رہتا ہے جب تک اسے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہ ہو۔ ضرورت ہو تو وہ بلا توقف جھوٹ بول دے گا۔ میکیاولی سیاست، مملکتی سطح پر، نظریہ ضرورت ہے۔ یہ عوامی سطح پر۔

ہمارے ہاں اس نظریہ کے متعلق بحث ہو رہی ہے کہ یہ اسلامی ہے یا غیر اسلامی! جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے، "نظریہ ضرورت" کی اصطلاح سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس، انوار الحق صاحب نے استعمال کی تھی۔ لیکن انہوں نے یہ دعوےٰ نہیں کیا تھا کہ یہ نظریہ اسلامی ہے۔ جب ہمارا نظامِ عدل ہی ہنوز اسلامی نہیں تو اس کا کوئی فیصلہ اسلامی کیسے قرار پا سکے گا۔ نظامِ عدل کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا معیار خود اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا۔ جب کہا کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴) "جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، وہ کافر ہیں۔" اور یہ ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں کے بیشتر قوانین ابھی کتاب اللہ کے خلاف ہیں۔ یہ نکتہ ضمنی طور پر مختلف عدالتوں میں زیرِ بحث آتا رہتا ہے لیکن تفصیل کے ساتھ اس پر بحث سپریم کورٹ میں مسٹر جسٹس (ریٹائرڈ) بی۔ زیڈ کیکاؤس بنام سٹیٹ میں سامنے آئی جس میں کہا گیا کہ جب تک مملکت اسلامی قوانین نافذ نہیں کرتی مقدمات کے فیصلے عام ملکی قوانین کی رُو سے ہوں گے۔ اس میں خصوصیت سے بھٹو کے مقدمہ قتل کا حوالہ دیا گیا تھا جس میں وکیل صفائی مسٹر یحییٰ بختیار نے کہا تھا کہ اسلامی قوانین کی رُو سے قتلِ خطا کی سزا موت نہیں ہو سکتی۔ اس دلیل کو بھی یہ کہہ کر مسترد کر دیا گیا تھا کہ اس مقدمہ کا فیصلہ اسلامی قوانین کی رُو سے نہیں بلکہ مملکتی قوانین کی رُو سے ہوا ہے۔

(P.L.D. AUGUST, 1980. P.P. 163 – 174. SC)

اس نظریہ کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کی بحث، لاہور ہائی کورٹ کے (حالیہ) چیف جج، جسٹس

جاوید اقبال کے اس بیان سے ہوئی جو انہوں نے ایک پریس کانفرنس میں دیا تھا۔ اخبارات میں شائع ہونے والی رپورٹ کے مطابق۔

> انہوں نے کہا کہ "نظریہ ضرورت" ایک اسلامی نظریہ ہے۔ اس کی سب سے پہلے وضاحت ایک مسلمان مفکر الماوردی نے کی تھی لیکن کم علمی کی وجہ سے لوگ اس نظریہ کو ایک غیر مسلم سے منسوب کر رہے ہیں۔ (جنگ لاہور۔ مورخہ ۷ر نومبر ۱۹۸۲ء)

صدیوں کی غلامی سے قوم میں خود اعتمادی کے فقدان، اور ذمہ داری قبول کرنے سے گریز کے جو جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں اس کا نتیجہ تقلید ہوتا ہے۔ تقلید کے معنی یہ ہیں کہ بجائے اس کے مسئلہ زیرِ نظر کے متعلق انسان خود تحقیق کرنے کے بعد پوری خود اعتمادی کے ساتھ کسی نتیجہ پر خود پہنچے۔ وہ اسلاف میں سے کسی کو بطور سند پیش کر کے مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس نے اپنے دعوے کے حق میں ثبوت مہیا کر دیا۔ الماوردی، دَورِ عباسیہ (پانچویں صدی ہجری) کا ایک فقیہہ اور سیاست دان تھا۔ سوال یہ ہے کہ اس کا کوئی قول یا نظریہ (اسلامی ہونے کی حیثیت سے) ہمارے لئے سند کیسے قرار پا سکتا ہے؟ مودودی (مرحوم) کے الفاظ میں "یہ سلف کون سے انبیاء تھے جن پر ایمان لانے کی مسلمانوں کو تکلیف دی گئی ہے" (تفہیمات حصہ دوم طبع ۱۹۵۹ء ایڈیشن ۴۲)۔ الماوردی کا سند قرار پانا تو ایک طرف، یہ بھی طے نہیں پا سکا کہ اس نے یہ کچھ کہا بھی ہے یا نہیں جسٹس جاوید اقبال کے دعوے کے جواب میں اسی اخبار (جنگ) کی ۲ر دسمبر ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں احمد بشیر صاحب کا ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے :۔

> جناب جسٹس جاوید اقبال نے دعوے کرتے ہوئے دلیل نہ دی۔ الماوردی کے کسی قول کی سند فراہم نہ کی۔ کتاب سے کوئی اقتباس پیش نہ کیا۔ صورت حالات پر کوئی بحث نہ فرمائی یہ بھی ضروری نہ سمجھا کہ وہ اپنے استنباط کی بنیاد پیش کریں ۔۔۔۔ اگر ان کے پاس کوئی حوالہ ہے تو وہ کرم کریں اور ہمیں عطا فرمائیں۔

جہاں تک ہماری نگاہ ۔۔۔۔ یاوری کرتی ہے۔ ان سطور کی تحریر تک احمد بشیر صاحب کے اس چیلنج کے جواب میں محترم مسٹر جسٹس جاوید اقبال کی طرف سے تردید یا وضاحت کا کوئی بیان شائع نہیں ہوا۔

ہمیں حیرت ہے کہ یہ حضرات ہزار سال پیچھے جا کر جو کسی الماوردی کی سند پیش کرتے ہیں، تو ان کی نگاہ خود اپنے دَور کے ایک "مجتہد" اور اقامت دین کے داعی کی طرف کیوں نہیں اٹھی؟ ہماری مراد سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) سے ہے جنہوں نے اس زمانے میں "نظریہ ضرورت" کو بڑے طمطراق سے پیش کیا تھا۔ بات یوں ہوئی کہ ان کے کچھ نامور رفقا نے ان کے خلاف کچھ الزامات عائد کئے جن کے جواب میں انہوں نے اس نظریہ کو پیش کیا۔ جھوٹ بولنے کے جواز میں انہوں نے کہا :۔

> راست بازی و صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن مئی ۱۹۵۸ء ص ۲۵)

ان کی جرأت بے باک نے یہاں تک کہہ دیا کہ

اس کی عملی مثالیں بھی احادیث میں موجود ہیں۔ کعب بن اشرف کے قتل کے لئے محمد بن مسلمہ کو جب حضورؐ نے مامور کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں حضورؐ نے بالفاظ صریح انہیں اس کی اجازت دی[1]۔ (ایضاً ص۵۵)

مودودی (مرحوم) کے خلاف ان کے رفقاء نے یہ الزام بھی عائد کیا کہ انہوں نے تحریک کے آغاز میں جو اصول پیش کئے تھے (اب) جب کہ حصولِ اقتدار کی کوششیں کی جا رہی ہیں، ان اصولوں کو بالائے طاق رکھا جا رہا ہے۔ انہوں نے (حسب عادت) جواب میں فرمایا کہ میں نے اگر ایسا کیا ہے تو کون سے جرم کا مرتکب ہو گیا ہوں۔ ....

...... خود رسول اللہؐ نے بھی تو (معاذ اللہ۔ صد بار معاذ اللہ) ایسا ہی کیا تھا۔

اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرقِ مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اسی چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبان مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی[2]۔ لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپؐ نے ہدایت دی کہ "الائمۃ من قریش" امام قریش میں سے ہوں گے[3]۔

ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص مسئلہ میں یہ ہدایت مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ (ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۵۲ء۔ ص۲۳)

مودودی مرحوم تقیہ کے بھی قائل تھے۔ وہ اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں آل عمران کی آیت ۲۸ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ

"اپنے بچاؤ کے لئے اگر بدرجہ مجبوری کبھی کفار کے ساتھ تقیہ کرنا پڑے تو وہ بھی اس حد تک ہونا چاہئے کہ...... (تفہیم القرآن۔ جلد اوّل۔ ۱۹۵۱ء ایڈیشن۔ ص۲۴۲)

تقیہ (اور متعہ) اہلِ تشیع کے عقائد ہیں۔ ہم ان سے بحث نہیں کر رہے۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مودودی مرحوم کے نظریہ ضرورت کا لازمی نتیجہ تھا کہ اس قسم کے عقائد کی بھی گنجائش پیدا کر لی جائے۔

"نظریہ ضرورت" کو اسلامی ثابت کرنے کے لئے کیا یہ شذرات کافی نہیں جو اما و روی کو بحث میں لایا جائے؟ پاکستان میں ویسے بھی مودودی مرحوم کے برانڈ کا اسلام رائج کیا جا رہا ہے۔ اس میں یہ نظریہ بھی شامل ہو جائے گا جب

---

[1] ظاہر ہے کہ اس قسم کی حدیثیں دورِ ملوکیت میں وضع ہوئی تھیں۔

[2] قائم نہیں کی۔ اس کی کوشش فرمائی! (معاذ اللہ)۔

[3] ظاہر ہے کہ اس قسم کی حدیثیں دورِ ملوکیت میں وضع ہوئی تھیں

مودودی مرحوم نے یہ ارشادات رقم فرمائے تھے تو ان کے مذکورہ بالا رفقا تو ان سے علیحدہ ہو گئے تھے لیکن اس پر مذہبی حلقوں میں سے کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ لہٰذا ان کی طرف سے اب بھی اعتراض نہیں ہوگا۔ اعتراض طلوع اسلام نے کیا تھا اور حسبِ معمول گالیاں کھائی تھیں۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ "نظریہ ضرورت" درحقیقت سیکولرازم کا دوسرا نام ہے۔ سیکولرازم کا مفہوم یہ ہے کہ انسان پر خارج سے عائد کردہ کوئی پابندی نہیں۔ وہ اپنے (انفرادی اور اجتماعی) امور کا فیصلہ کرنے میں آزاد ہے۔ جیسے مصلحت کا تقاضا ہو ویسا کر لیا جائے۔ یہ ہے سیکولرازم یا نظریہ ضرورت۔ شخصی حکومتوں میں ایسے فیصلے سربراہ مملکت کرتا ہے۔ مغرب کے جمہوری نظام میں، انسانوں کی اکثریت

اسلام اس نظریہ، ازم اور مسلک کی بالکل ضد ہے۔ (جب ہم اسلام کہیں گے تو اس کی سند قرآن کریم ہوگی)۔ اس کا موقف یہ ہے کہ انسانی زندگی (انفرادی اور اجتماعی) کے لئے خدا نے کچھ پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ جو ان پابندیوں کو تسلیم کرتا ہے اسے مسلم کہا جاتا ہے، اور جو نظام ان پابندیوں کی حدود کے اندر رہتے ہوئے کارفرما ہوتا ہے اسے اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کہا جاتا ہے۔ یہ پابندیاں (یا حدود) اقدار، اصول، احکام اور قوانین کی شکل میں قرآن مجید کے اندر محفوظ ہیں۔ یہی وہ حقیقتِ کبریٰ تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ "ہماری آزادی اور پابندی کے حدود خدا کی کتاب متعین کرتی ہے"۔ یہ پابندیاں ابدی ہیں اور غیر متبدل ارشاد خداوندی ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ (۶/۱۱۵)

تیرے رب کے کلمات (ارشادات) صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ کوئی شخص ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

ان پابندیوں کی کیفیت یہ ہے کہ بعض پابندیاں ایسی ہیں جنہیں مطلق حرام کہا گیا ہے۔ جیسے ماں یا بہن کے ساتھ نکاح۔ اور بعض ایسی ہیں جو فی ذاتہٖ حرام یا ناجائز نہیں۔ جس طریق سے انہیں حاصل کیا جائے، وہ انہیں جائز یا ناجائز بنا دیتا ہے۔ جیسے دولت فی نفسہٖ نہ جائز ہے نہ ناجائز۔ اگر اسے جائز (بالحق) طریق سے حاصل کیا جائے تو حلال و طیب ہے۔ ناجائز (باطل) طریق سے حاصل کی جائے تو حرام ہوگی۔ میکیاولی فلسفہ زندگی کی رو سے، طریق کو بھی کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔ اس میں مطلب حصولِ مقصد سے ہوتا ہے۔ وہ جس طریق سے بھی حاصل ہو جائے۔ اس کا یہ تفریق زبانِ زد خلائق ہے

(MEANS ARE JUSTIFIED BY THE ENDS ACHIEVED)

اس کے برعکس قرآن کریم نے مقاصد کے علاوہ ان ذرائع، اسباب یا طریق میں بھی جائز اور ناجائز کی تفریق کی ہے جن کی رو سے وہ مقصد حاصل کیا جائے۔ طریق کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس نے سب سے پہلی دعا یہ سکھائی ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ (۱/۵)۔ بارالٰہا! ہماری راہ نمائی صحیح اور سیدھے راستے کی طرف کر دے۔ چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں۔

(۱) روٹی تو وہی ہوتی ہے۔ اسے اپنی کمائی سے حاصل کیا جائے تو حلال ہے۔ چوری کی ہو تو حرام۔ اسی لئے فرمایا كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا (۲/۱۶۸)۔ جو کچھ زمین سے پیدا ہوتا ہے اسے حلال و طیب طریق سے کھاؤ۔

(۲) گوشت بکرے کا ہوتا ہے۔ اسے خدا کا نام لے کر ذبح کیا جائے تو حلال (۶/۱۱۹)۔ اس طرح ذبح نہ کیا جائے تو حرام (۶/۱۲۲)۔

(۳) دولت وہی ہوتی ہے۔ اسے باطل طریق سے حاصل کیا جائے تو حرام۔ حق کے مطابق حاصل کیا جائے تو حلال۔ اسی لئے فرمایا۔ وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (۲/۱۸۸)۔ آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریق سے مت کھاؤ۔ طریق حصولِ دولت میں فرق نہ کرنے والوں کی گمراہی تھی جس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ فَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا (۲/۲۷۵)۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ربوٰا اور بیع میں کیا فرق ہے۔ دونوں ایک ہی ہیں۔ اس لئے کہ دونوں میں اپنے اصل زر سے کچھ زائد وصول کیا جاتا ہے۔ فرمایا یہ غلط ہے۔ وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا (۲/۲۷۵) خدا نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربوٰا کو حرام۔ (ان دونوں میں کیا فرق ہے، اس کی تشریح کا یہ مقام نہیں۔ اس وقت ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قرآن کریم نے جو پابندیاں عائد کی ہیں، انہیں ملحوظ رکھا جائے تو ہمارا اقدام جائز۔ ان سے تجاوز کیا جائے، تو ہمارا اقدام بھی حرام۔ اور اس طرح حاصل شدہ مقصد بھی حرام)۔ ضمناً یہ جو کہا جاتا ہے کہ اگر اپنے مال میں سے اڑھائی فی صد زکوٰۃ نکال دی جائے تو بقایا مال خواہ کیسا ہی ہو، طیب اور پاکیزہ ہو جاتا ہے۔ تو یہ بڑی خطرناک غلطی ہے۔ جو مال حلال و طیب نہیں، اڑھائی فی صد زکوٰۃ تو ایک طرف۔ وہ سارے کا سارا بھی کسی اچھے کام میں صرف کر دیا جائے، تب بھی حلال و طیب نہیں قرار پا سکتا۔ جس طرح (مثلاً) اگر جھٹکے کے گوشت کو فی سبیل اللہ بھی بانٹ دیا جائے تو وہ حلال نہیں ہو جاتا۔

(۴) جنسی جذبہ کی تسکین ممنوع نہیں۔ اسے نکاح کی رُو سے حاصل کیا جائے تو حلال۔ زنا کے ذریعے حاصل کیا جائے۔ تو حرام۔ زنا ہی نہیں۔ اس نے نکاح کی حلّت کے بعد کہا ہے فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ (۲۳/۷) جو اس کے سوا کوئی اور طریق اختیار کریگا وہ حدود شکنی کا مرتکب ہوگا۔

(ضمناً) اللہ تعالیٰ نے تو کہا تھا کہ جنسی خواہش کی تسکین کے لئے نکاح کے سوا کوئی طریق بھی اختیار کیا جائے تو وہ حدود شکنی ہوگی، لیکن نظریہ ضرورت کے داعی، مودودی مرحوم، مشت زنی (کو حرام قرار دیتے ہوئے بھی) جائز ٹھہراتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:-

"صحیح مسلک تو یہی ہے کہ یہ فعل حرام ہے۔ البتہ عقل یہ حکم لگاتی ہے[۱] کہ اس کی حرمت، زنا اور

[۱] خدا کے فیصلہ کے بالمقابل عقل کا حکم

عمل قوم لوط اور وطی بہائم کی بہ نسبت کم تر ہے۔ اس لئے کسی شخص کو ان گناہوں میں سے کسی ایک میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو اور اس سے بچنے کے لئے وہ اپنے جوش طبع کی تسکین اس ذریعہ سے کرے تو اس کے حق میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ اسے سزا نہ دے۔

(رسائل و مسائل جلد دوم۔ ص ۲۰۲)

حتیٰ کہ وہ متعہ کے بھی قائل ہیں۔ لکھتے ہیں:-

فرض کیجئے ایک جہاز سمندر میں ڈوب جاتا ہے اور ایک مرد اور عورت کسی تختے پر بہتے ہوئے کسی ایسے سنسان جزیرہ میں پہنچ جاتے ہیں جہاں کوئی آبادی موجود نہ ہو۔ وہ ایک ساتھ رہنے پر مجبور ہیں۔ اور شرعی شرائط کے مطابق ان کے درمیان نکاح بھی ممکن نہیں ایسی حالت میں ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ باہمی خود ہی ایجاب و قبول کرکے اس وقت تک کے لئے عارضی نکاح کرلیں جب تک وہ آبادی میں نہ پہنچ جائیں یا آبادی ان تک نہ پہنچ جائے۔ کم و بیش ایسی ہی اضطراری صورتیں اور بھی ہو سکتی ہیں۔ متعہ اسی طرح کی اضطراری حالت کے لئے ہے۔ (ترجمان القرآن۔ اگست ۱۹۵۵ء)

ایسے حالات میں قرآن کی ہدایت کیا ہے اسے ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ اس مقام پر اتنا دیکھئے کہ "نظریہ ضرورت" انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ اس سے ہر قسم کی پابندیاں توڑنے کا جواز مل جاتا ہے۔ یہ جو ہمارے آج کل کے نوجوان، اخلاقیات کے صحرا میں ناقۂ بے زمام کی طرح جولانیاں کھا رہے ہیں، تو یہ اسی قسم کی تعلیم کا نتیجہ ہے جو متفرع ہے نظریہ ضرورت پر۔

(۵) اقتدار شجر ممنوعہ نہیں۔ اسے تو بلکہ قرآن کریم نے جماعت مومنین کا فریضہ قرار دیا ہے کیونکہ اس کے بغیر اسلامی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہی اقتدار جائز، حلال، اور منشاء خداوندی کے مطابق ہے جو الحق (یعنی قرآن) کے تجویز کردہ طریق کے مطابق حاصل کیا جائے۔ جو اس طرح حاصل نہ کیا جائے وہ استبداد ہے۔ اور بارگہ خداوندی میں سنگین ترین جرم۔ (مثلاً) وہ اقوام سابقہ کے تباہ کن جرائم کا ذکر کرتے ہوئے "قوم عاد" کے ضمن میں کہتا ہے کہ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (۴۱/۱۵) (نیز ۲۸/۳۹، ۴۶/۲۶)۔ انہوں نے حق کے طریق کے خلاف اقتدار حاصل کیا۔ حق کے خلاف وہ کونسا طریق تھا جس کی رو سے انہوں نے اقتدار حاصل کیا تھا، اس کی تشریح آیت کے اگلے الفاظ نے یہ کہہ کر کر دی کہ وَقَالُوا مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (۴۱/۱۵)۔ "وہ کہتے تھے کہ ہم سے زیادہ قوت والا کون ہے؟" یعنی قوت کے ذریعے حکومت قائم کرنا حق کے خلاف ہے۔ حق کے مطابق طریق کو قرآن نے مشاورت کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے جب کہا ہے کہ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸)۔ جماعت مومنین کی حکومت مشاورت (باہمی رضامندی) سے قائم ہوگی۔

ہم نے ان پابندیوں میں سے، جنہیں قرآن کریم نے عائد کیا ہے، چند ایک کا ذکر کیا ہے۔ ورنہ اس کے نظام کی ساری عمارت "سمعنا و اطعنا" کی بنیادوں پر استوار ہے۔ یعنی ہمیں اسی حد تک آزادی حاصل ہے جس حد تک قرآن کی عائد کردہ پابندیاں اجازت دیں اس سے آگے نہیں۔ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا

تَعْتَدُوْهَا (۲/۲۲۹)۔" یہ خدا کی باندھی ہوئی حدود ہیں۔ ان سے تجاوز مت کرو۔" قرآن کریم نے یہ کہیں نہیں کہا کہ تم حسبِ ضرورت ان پابندیوں کو توڑ سکتے ہو۔ ایسا کرنے کا اختیار تو اس نے (اور تو اور) حضور نبی اکرمؐ کو بھی نہیں دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے فرمایا کہ تم اعلان کرو کہ ان پابندیوں میں، میں بھی کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتا: قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ (۱۰/۱۵)۔ "ان سے کہہ دو کہ مجھے اس کا قطعاً اختیار نہیں کہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی کر سکوں میرا فریضہ اس وحی کا اتباع کرنا ہے جو میری طرف نازل کی جاتی ہے۔ اور بس۔ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ (۱۰/۱۵)۔" میں بھی اگر ان کی خلاف ورزی کروں تو خدا کے عذابِ عظیم سے ڈرتا ہوں۔" اگر حضورؐ بھی ایسا کرنے کا اختیار نہیں رکھتے تھے تو اور کون اس کا مجاز ہو سکتا ہے؟

اس ضمن میں دو ایک اور امور کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ قرآن کریم نے بعض احکام اصولی طور پر دیئے ہیں۔ ان اصولوں کو بروئے کار لانے کا عملی طریق خود نہیں متعین کیا۔ اسے اسلامی مملکت پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے وقت کے حالات کے مطابق ان کا طریق کار خود متعین کرے۔ لیکن ان میں بھی کوئی ایسا طریق وضع نہیں کیا جائے گا جو اس اصول سے ٹکراتا ہو جسے قرآن نے متعین کر دیا ہے۔ مثلاً عدل کے لئے قرآن نے متعین کر دیا کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرنے کو عدل کہا جائے گا۔ اس حکم پر عمل پیرا ہونے کے لئے اسلامی مملکت طریق کار خود متعین کرے گی لیکن وہ جو طریق کار بھی متعین کرے وہ بھی کتاب اللہ کے کسی اصول کے خلاف نہیں ہوگا۔

دوسرے یہ کہ جن امور کو خدا نے کھلا چھوڑ دیا ہے، اسلامی مملکت بر تقاضائے وقت ان پر خود مناسب پابندیاں عائد کر سکتی ہے۔ مثلاً قرآن نے ذبیحہ کو حلال اور جھٹکے کو حرام قرار دیا ہے۔ لیکن اس کی تخصیص نہیں کی کہ حلال گوشت کو کس طرح اور کس قدر صرف میں لایا جا سکتا ہے۔ اسلامی حکومت یہ پابندی عائد کر سکتی ہے کہ ہفتہ میں دو دن کا ناغہ ہو۔ لیکن وہ جھٹکے کو حلال قرار نہیں دے سکتی۔ حلال گوشت کے صرف پر پابندی لگا سکتی ہے۔

بالفاظِ دیگر اسلامی مملکت خدا کی عائد کردہ کسی پابندی کو توڑ نہیں سکتی۔ جن معاملات کو اس کے اختیار پر چھوڑ دیا گیا ہے وہ ان میں مناسب پابندیاں عائد کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ پابندیاں قرآن کے کسی اصول سے ٹکرائیں نہیں۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ۔ اس کا ابدی حکم ہے۔ کلمۃ اللہ میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

قرآن کریم کی عائد کردہ پابندیوں میں جہاں استثناء کی ضرورت تھی اسے خود خدا نے واضح کر دیا۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں کھانے پینے کی ان چار چیزوں کا ذکر آیا ہے جنہیں مطلق حرام قرار دیا گیا ہے۔ لیکن انہی میں اس استثناء کا بھی ذکر ہے۔ سورہ بقرہ میں ہے:۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۲/۱۷۳) و نیز (۶/۱۴۵، ۱۶/۱۱۵)

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے اس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"اس نے تم پر یہی حرام کیا ہے۔ مُردہ جانور اور لہو اور گوشت سؤر کا۔ اور جس جانور پہ نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا[1] پھر جو کوئی بے اختیار ہو جائے نہ تو نافرمانی کرے اور نہ زیادتی تو اس پر کچھ گناہ نہیں بیشک اللہ بڑا بخشنے والا ہے۔ نہایت مہربان۔"

اس اضطراری حالت کے متعلق سورۃ المائدہ میں ہے: فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ (۵/۳) "پھر جو کوئی لاچار ہو جائے بھوک کی وجہ سے لیکن گناہ پہ مائل نہ ہو"۔ یعنی اگر کوئی شخص بھوک کی وجہ سے ایسا بے اختیار اور لاچار ہو جائے کہ اسے کھانے کے لئے کچھ اور نہ ملے تو وہ موت سے بچنے کے لئے ان حرام چیزوں میں سے کوئی چیز اتنی کھا سکتا ہے جس سے اس کی بھوک رفع ہو جائے۔ قرآن کریم نے یہ استثناء اس ایک حکم میں دی ہے۔ یہ نہیں کہ اسے ایک کلیہ کے طور پر بیان کر دیا ہو کہ جو شخص جس حرام شے کو چاہے عندالضرورت اختیار کر سکتا ہے۔ اضطراری حالت بھوک کے علاوہ (بلکہ اکثر حالات میں بھوک سے بھی زیادہ شدید اور ناقابلِ برداشت) جنسی خواہش ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے اس کے لئے بھی نہیں کہا کہ ایسی صورت میں اس جذبہ کی تسکین ناجائز طریق سے بھی کی جا سکتی ہے۔ اس کے برعکس اس نے کہا کہ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا (۲۴/۳۳)۔ جن کے لئے نکاح کی صورت پیدا نہ ہو سکے وہ ضبطِ نفس سے کام لیں۔ (مودودی مرحوم نے جو مشت زنی اور متعہ کی استثناء فرمائی وہ قرآن کے اس صریح حکم کے خلاف ہے)۔

(۲)

اس سلسلہ میں مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن اس کی ضرورت پیش آ گئی۔ وہ اس طرح کہ نظریہ ضرورت کو اسلامی ثابت کرنے کے لئے قرآن کے اس استثناء کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اور یہ معلوم کر کے آپ کو حیرت ہوگی کہ اسے پیش کیا گیا ہے وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس شیخ آفتاب حسین کی طرف سے۔ انہوں نے فرمایا ہے "نظریہ ضرورت کو قرآن مجید نے جائز قرار دیا ہے اور پوری اسلامی تاریخ میں نظریہ ضرورت کارفرما نظر آتا ہے۔ انہوں نے قرآن مجید کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ موت سے بچنے کیلئے سؤر کا گوشت کھانا حلال ہے۔ یہ سؤر کا گوشت نظریہ ضرورت کے تحت ہی حلال ہوتا ہے۔ (جنگ لاہور ۔ ۱۹ نومبر ۱۹۸۴ء)۔

علامہ اقبالؒ نے کہا تھا ؎

زمن بر صوفی و مُلّا سلامے | کہ پیغام خدا گفتند ما را
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت | خدا و جبرئیلؑ و مصطفےٰؐ را
(ارمغانِ حجاز صفحہ ۱۰۲)

لیکن یہاں تو معاملہ "صوفی و مُلّا" سے بھی آگے چلا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں بصد ادب گذارش ہے کہ: (۱) قرآن کریم نے "اضطرار" کا لفظ استعمال کیا ہے "ضرورت" کا نہیں۔ ضرورت کا لفظ تو سارے قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ ضرورت اور اضطرار کا فرق عربی لغت سے واقف حضرات پر روشن ہے (جیسا کہ متعلقہ آیات کے ترجمہ کے سلسلہ میں پہلے لکھا جا چکا ہے) مولانا محمود الحسنؒ نے اضطرار کا ترجمہ بے اختیاری اور لاچاری کیا ہے۔ شاہ رفیع الدینؒ نے اس کا ترجمہ کیا ہے "پھر جو کوئی بے بس ہو جائے"۔

قرآن مجید کے انگریزی مترجمین نے اس کا ترجمہ (FORCED) ; (COMPELLED) کیا ہے۔ (LANE) نے اپنے لغت میں لکھا ہے۔ (FORCED OR DRIVEN TO - AGAINST HIS WILL)۔ ان تراجم اور معانی سے ضرورت اور اضطرار کا فرق واضح ہو جائے گا۔ قرآن مجید نے اس مجبوری اور بے بسی کو بھوک کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ یہ ایسا طبعی تقاضا ہے جس سے متعلق شخص بھی محسوس اور معلوم کر سکتا ہے کہ اضطراری (مجبوری کی) حالت پیدا ہو گئی ہے یا نہیں۔ اور دوسرے لوگ بھی اسے محسوس اور

---

[1] قرآن کریم نے جانور کو مخصوص نہیں کیا۔ ہر وہ شے جسے اللہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کیا جائے۔ حرام ہوگی۔

معلوم کر سکتے ہیں برعکس اسکے "ضرورت" کوئی محسوس اور مرئی کیفیت نہیں۔ ویسے بھی ہر شخص کا ضرورت کا پیمانہ اپنا اپنا ہوتا ہے۔ ایک چیز ایک شخص کے نزدیک ضرورت ہے دوسرے کے نزدیک ضرورت نہیں۔ اگر حرام شے کو حلال قرار دے دینے کا معیار اپنی اپنی ضرورت ہو تو معاشرے میں جس قسم کی لاقانونیت (ANARCHY) پیدا ہو جائیگی ظاہر ہے (۲) اللہ تعالیٰ نے یہ اجازت خود دی ہے۔ کسی اور کو اس کا مجاز نہیں ٹھہرایا۔ (۳) یہ اجازت صرف اس مخصوص حالت (اضطرار) کی وجہ سے مجبوری کی حالت میں ہے کسی انسان کو اس کا اختیار حاصل نہیں کہ وہ اس اجازت کا سہارا لیکر اپنی ضرورت کے مطابق ہر ناجائز کو جائز قرار دے لے۔ محترم جسٹس اس قانونی نکتہ سے بخوبی واقف ہونگے کہ کسی مقید قانون کو مطلق قرار دے دینے سے قانون کی حیثیت ہی کچھ نہیں رہتی۔ خود قرآن کریم نے بھی اس کے سوا کسی حالت کو اضطراری قرار نہیں دیا (۴) جسٹس ممدوح نے فرمایا ہے کہ "پوری اسلامی تاریخ میں نظریہ ضرورت کارفرما نظر آتا ہے"۔ سو گزارش ہے کہ ہماری یہ تاریخ "اسلامی تاریخ" نہیں۔ وہ تو ملوکیت کی تاریخ ہے جو اسلام کی ضد ہے۔ ملوکیت کا تو تمام کاروبار "نظریہ ضرورت" کے تحت چلتا ہے۔ اس میں کسی قاعدے اور قانون کی پابندی ہوتی نہیں۔ صاحب اقتدار کی ضرورت اور مصلحت مملکت کا قانون قرار پا جاتی ہے۔ اسکے برعکس خلافت (اسلامی مملکت) قرآن مجید کی عائد کردہ پابندیوں کے دائرے میں جکڑی ہوتی ہے اور کسی مصلحت کے تحت بھی ان سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ اقبالؒ نے ان دونوں میں بڑی وضاحت سے امتیاز کیا ہے جب کہا ہے کہ ؎

خلافت بر مقام ما گواہی است — حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ — خلافت حفظ ناموس الٰہی است

اس سے بھی واضح تر الفاظ میں ؎

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است — نظامش خام و کارش ناتمام است
غلام فقر آں گیتی پناہم — کہ در دینش ملوکیت حرام است
(ارمغان حجاز ص ۲۶-۲۷)

اقبالؒ نے جو کہا ہے کہ "ہنوز اندر جہاں آدم غلام است" تو اس کا مطلب واضح ہے کہ دنیا میں کوئی مملکت بھی ایسی نہیں جو خدائی پابندیوں میں محصور رہے۔ ہر جگہ سیکولرازم یعنی انسانوں کا خود ساختہ نظام قائم ہے جس کا کاروبار "نظریہ ضرورت" کے تابع چلتا ہے۔ ہماری تاریخ میں اس قسم کے نظریات ان فقہا اور سیاستدانوں کے تراشیدہ ہیں۔ جو بادشاہ کو زمین پر خدا کا سایہ (السلطان ظل اللہ علی الارض) قرار دیتے تھے۔ محراب و منبر پر ان کے اقتدار کے استحکام کی دعائیں مانگتے تھے۔ جن کا فیصلہ یہ تھا کہ بادشاہ سے سوائے قصاص کے کسی جرم کا مواخذہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہاں تک کہ ان سے حشر میں بھی کسی جرم کی بازپرس نہیں ہوگی۔ اس قسم کے دور میں وضع شدہ نظریات کو اسلام کے لئے سند قرار دینا بڑی جرأت اور زیادتی ہے۔

اگر اسے سوء ادب نہ تصور کر لیا جائے تو ہم محترم چیف جسٹس سے دریافت کرنے کی جرأت کریں گے کہ اگر ہماری پوری تاریخ میں نظریہ ضرورت کارفرما رہا ہے اور اس نظریہ کو قرآن مجید نے جائز قرار دیا ہے، تو پھر سود کو کیوں ملعون (بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ) قرار دیا جاتا ہے؟ وہ بھی تو اسی اسلامی تاریخ کا ایک جزو ہے؟

ہم اپنے ارباب علم و دانش کی خدمت میں باادب گزارش کریں گے کہ وہ اس قسم کے مسائل پر سیکولر نقطہ نگاہ سے بحث کیا کریں۔ اسلام (مذہب) کو درمیان میں نہ لایا کریں۔ ہم پہلے ہی اس کا کافی حلیہ بگاڑ چکے ہیں۔ اسلام کی بات اسلامی مملکت میں کرنی چاہئے۔ اور اسلامی اور غیر اسلامی مملکت میں امتیاز قرآن کریم نے نہایت واضح الفاظ میں یہ کہہ کر کر دیا ہے کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔۔۔۔ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔۔۔۔ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۵/۴۴، ۴۵، ۴۷) "جو بھی کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ ظالم ہیں۔ فاسق ہیں۔"

بھولی ہوئی کہانیاں!

روزنامہ جنگ (لاہور) کی ۲۵ دسمبر کی اشاعت میں، (مولانا) کوثر نیازی صاحب نے اپنے کالم میں لکھا ہے :-

دسمبر ۱۹۷۶ء میں پاکستان بھر میں قائداعظمؒ محمد علی جناح کی صد سالہ تقریبات بڑی دھوم دھام سے منائی گئیں۔ اس سلسلہ میں قومی اسمبلی اور سینٹ کے ایک مشترکہ اجلاس منعقدہ ۲۱ دسمبر ۱۹۷۶ء میں بھی بانئ پاکستان کو شاندار خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ اس موقع پر میں نے بھی تقریر کی۔ یہ تقریر اب تک غیر مطبوعہ تھی۔ اب اسے قائداعظمؒ کے یومِ ولادت کی مناسبت سے، قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے اپنی تقریر درج فرمائی ہے جس کے دوران کہا ہے :-

"مفتی صاحب! مولانا صاحب! اباسوں میں کیا رکھا ہے؟ جو کچھ ہے عمل ہے۔ آیئے ترک رسوم کے اس موجد کا ایک واقعہ سنیئے! جناح مذہبی تاجر نہ تھا مذہب کا مفکر تھا اور دنیاوی امور میں پروٹوکول کا شدت سے قائل و عامل، جس کو اپوائنٹمنٹ کے بغیر ملنے کا کوئی تصور تک نہیں کر سکتا تھا اس کی جلوت و خلوت میں اس شخص کو ہر وقت ہر لمحے تمام فارمیلیٹیز کے بغیر حاضر ہونے کی اجازت تھی جو انہیں کلام اللہ میں تدبر کرنے کے لئے آیات قرآنی سنایا کرتا تھا وہ خود مروی ہے کہ ایک نشست میں میں نے قرآن مجید کے کسی مقام کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ساری عمر مبارک اپنے مقصد کے حصول میں جانکاہ مشقتیں اٹھاتے گذر گئی ایسا نظر آتا ہے کہ کسی وقت حضورؐ کے قلب مطہر میں حسین و معصوم سی آرزو ابھری کہ بار الہا! میں اپنے مقصد کو اپنی آنکھوں کے سامنے حاصل ہوتے بھی دیکھ سکوں گا یا میری آرزو اسی تگ و تاز میں گذر جائے گی؟ اللہ کی طرف سے اس کا جواب یہ ملا کہ

تیرا مقصد تیری زندگی میں تیرے سامنے آجائے یا اس سے پہلے ہی تو ہمارے پاس آجائے اس سے تجھے کچھ سروکار نہیں تیرا کام اس پیغام کو عام کئے جانا ہے یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق اس کا نتیجہ کب سامنے آتا ہے"

اس شخص نے لکھا ہے کہ یہ سن کر قائداعظمؒ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے، کیوں؟ قائد ہی کے الفاظ میں سنیئے فرمایا :-

"جب اللہ تعالٰے نے ایسی عظیم ہستی کے لئے بھی ذرا سی رعایت روا نہیں رکھی اور صاف کہہ دیا کہ یہ ہمارے قانون کے مطابق واقع ہوگا خواہ تمہاری زندگی میں ہو اور خواہ اس کے بعد۔ تو ہم کس باغ کی مولی ہیں سو وہ ہماری خاطر اپنے قانون میں کیوں رعایت برتے گا؟ اس لئے معلوم نہیں کہ ہم اپنی آنکھوں سے پاکستان بنتے دیکھ سکیں گے کہ نہیں ؟"

یہ کسی صوفی یا مولوی کا ردِ عمل نہیں محمد علی جناحؒ کا ردِ عمل ہے۔ آپ نے بہت سی تفسیریں پڑھی ہوں گی لیکن اس آیت پر جناحؒ جیسے عملی آدمی کا تبصرہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ راوی لکھتا ہے انہوں نے کہا:۔

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ نے بات بنا دی ورنہ خدا کا جواب تو بڑا خشک اور قانونی جواب تھا"!

اس واقعہ کے راوی ہیں جناب غلام احمد پرویز جن سے کسی کو ہزار اختلاف ہو لیکن قائداعظمؒ کے ساتھ ان کی رفاقت اور تحریکِ پاکستان میں ان کی قلمی خدمات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا"!۔

مقامِ تشکر ہے کہ نیازی صاحب نے اپنی تقریر میں پرویز صاحب کا نام لینے کی جراٗت فرمائی، ورنہ یہاں ہو یہ رہا ہے کہ نامور دانشوروں تک اپنی تحریروں اور تقریروں میں، پرویز صاحب کی تصانیف کے صفحوں کے صفحے دُہراتے چلے جاتے ہیں اور (نام لینا تو ایک طرف) اس کا خاص طور خیال رکھتے ہیں کہ کہیں اشارۃً کنایۃً بھی معلوم نہ ہونے پائے کہ یہ کس کے الفاظ ہیں؟ اور پیش کردہ واقعہ کا ماخذ کون سا ہے؟

نیازی صاحب نے جو واقعہ بیان فرمایا ہے، اس میں (غالباً بغرضِ اختصار) بعض کڑیاں چھوٹ گئی ہیں جس کی وجہ سے واقعہ میں ربط نہیں رہا۔ پرویز صاحب نے اس واقعہ کا اپنے اُس خطاب میں ذکر کیا تھا جسے انہوں نے قائداعظمؒ کے یومِ وفات کی تقریب منعقدہ ۱۲ ستمبر ۱۹۷۶ء میں پیش کیا تھا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پورے واقعہ کو ان کے الفاظ میں درج کر دیا جائے۔ انہوں نے کہا تھا:۔

"اور آخر میں ایک ایسا واقعہ جس کی یاد مجھے زندگی بھر نہیں بھول سکتی۔ اکثر لوگوں کو اس پر تعجب ہوتا ہے کہ میری اور قائداعظمؒ کی پوزیشن میں اس قدر بُعد کے باوجود، وہ کون سی بات تھی جس کی وجہ سے مجھے ان سے اس قدر قرب حاصل تھا۔ میرے اس زمانے کے قریبی احباب تو اس راز سے واقف تھے لیکن میں نے خود جن کا ذکر بہت کم کیا ہے۔ میرے اس قرب کی وجہ تھی اُن کا قرآنی ذوق۔ مجھے اس کی اجازت تھی کہ میں پہلے سے وقت لئے بغیر، ان کی فرصت کے اوقات میں حاضرِ خدمت ہو جایا کروں۔ میں جب بھی حاضر ہوتا، پیش آمدہ معاملہ کے بعد، قرآن کریم کے کسی نہ کسی اہم مقام پر بات شروع ہو جاتی۔ میں نے ان جیسا ذکی الفہم انسان بہت کم دیکھا ہے۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ خارے دید و احوالِ چین گفت۔ ذرا سے نکتہ سے پوری کی پوری بات فوراً سمجھ لیتے تھے۔ یہ غالباً مارچ ۱۹۴۷ء کا ذکر ہے کہ ایک نشست میں میں نے قرآن مجید کے کسی مقام کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ حضور نبی اکرمؐ کی ساری عمر (شریف) اپنے مقصد کے حصول میں جانکاہ مشقتیں اُٹھاتے گذر گئی۔ ایسا نظر آتا ہے کہ کسی وقت حضورؐ کے قلبِ مطہر

میں یہ حسین و معصوم سی آرزو ابھری کہ بار الٰہا! جب اپنے مقصد کو اپنی آنکھوں کے سامنے حاصل ہوتے دیکھ سکوں گا یا میری زندگی اسی تگ و تاز میں گذر جائے گی؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب ملا کہ: اِنْ مَا نُرِیَنَّکَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُھُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّکَ ۔ فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ وَ عَلَیْنَا الْحِسَابُ (۱۳/۴۰)۔ جو کچھ تمہارے پروگرام کے مخالفین سے کہا جا رہا ہے، وہ تیری زندگی میں تیرے سامنے آ جائے یا اس سے پہلے ہی تیری وفات ہو جائے۔ اس سے تجھے کچھ سروکار نہیں۔ تیرا کام اس پیغام کو عام کئے جانا ہے۔ یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق اس کا نتیجہ کب سامنے آتا ہے؟ میں رواروی میں یہ کچھ کہہ تو گیا لیکن میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پہ افسردگی سی چھا گئی۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے (ان کی آنکھوں میں آنسو بہت کم لوگوں نے دیکھے ہوں گے) یہ دیکھ کر میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ میں نے پوچھا کہ آپ پہ یہ کیفیت کیوں طاری ہو گئی؟ فرمایا کہ میں نے سوچا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایسی عظیم ہستیؐ کے لئے بھی ذرا سی رعایت روا نہیں رکھی اور صاف کہہ دیا کہ یہ ہمارے قانون کے مطابق واقع ہوگا۔ خواہ تمہاری زندگی میں ہو اور خواہ اس کے بعد ——— تو ہم کس باغ کی مولی ہیں۔ وہ ہماری خاطر اپنے قانون میں کیوں رعایت برتنے لگا۔ اس لئے معلوم نہیں کہ ہم اپنی آنکھوں سے پاکستان بنتے دیکھ سکیں گے یا نہیں؟ اس پہ مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے نادانستہ کیا غلطی ہو گئی۔ میرے مضراب نے ان کے کس تارِ رگِ جاں کو چھیڑ دیا؟ میں نے اس احساس کی شدت کو کم کرنے کے لئے کہا کہ نہیں! حضورؐ کے مقصد کا حصول حضورؐ کی حیاتِ طیبہ ہی میں ہو گیا تھا۔ فرمایا کہ یہ الگ بات ہے۔ لیکن خدا نے اپنے قانون میں تو کوئی رعایت نہیں برتی تھی۔ یہ کہہ کر وہ پھر ایک گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ اس وقت تو مجھے اس کا علم و احساس نہیں تھا، لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ اس گہری سوچ میں ان کے پیشِ نظر (شاید) اپنے پارٹی ممبران کے سینوں میں محفوظ رکھا ہوا وہ نقشہ ہوگا جس کا تذکرہ اب ماؤنٹ بیٹن نے کیا ہے۔ میں رخصت ہونے لگا تو فرمایا کہ عزیزم! جو کچھ میں نے کہا ہے اس سے کوئی غلط مفہوم نہ لے لینا۔ قانونِ خداوندی کے بے لچک ہونے کے باوجود، ہمیں اپنے سامنے اسوۂ رسول اللہؐ رکھنا چاہئے۔ حضورؐ نے اس جواب کے ملنے کے بعد اپنی تگ و تاز میں کسی قسم کی کمی نہیں کر دی تھی۔ ہمیں بھی اپنی جدوجہد بدستور جاری رکھنی چاہیئے اور نتیجہ کا انتظار خدا کے قانون کے مطابق کرنا چاہیئے ——— ہمیں بھی اپنے مقصد کی صداقت پر یقینِ محکم ہے۔ اعلانِ پاکستان کے بعد جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے اس عدیم النظیر کامیابی پر ہدیۂ تبریک پیش کرنے کے بعد، مندرجہ بالا واقعہ کی یاد دلائی، تو ہنس کر فرمایا کہ نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ نے بات بنا دی۔ ورنہ خدا کا جواب تو بڑا روکھا پھیکا سا تھا"۔

نیازی صاحب نے اپنی اسی تقریر میں آگے چل کر کہا تھا:

> تو یہ تھے جناح، یہ تھا اقبال کا مردِ مومن - وہی مردِ قلندر جس کے خلاف بڑے بڑے صاحبانِ جبہ و دستار صف آرا تھے۔ جیسے ہیٹ پہننے سے منع کیا جاتا تھا تو جواب ملتا تھا۔ ویسے تو میں شاید چھوڑ دیتا لیکن اب مسلمانوں کو متاثر کرنے کے لئے چھوڑا تو یہ منافقت ہوگی۔ (ایضاً)

یہ واقعہ بھی پرویز صاحب کے ساتھ ہی پیش آیا تھا۔ چونکہ یہ بڑا دلچسپ بھی ہے اور حقیقت کشا بھی، اس لئے ہم اسے بھی پرویز صاحب ہی کے الفاظ میں پیشِ خدمت قارئین کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اس خطاب میں جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے، کہا تھا:-

سستی شہرت کا حصول

"عام لیڈروں کی سب سے بڑی خواہش سستی شہرت (CHEAP POPULARITY) حاصل کرنا ہوتی ہے۔ اس کے لئے وہ کون کون سے پاپڑ بیلتے اور کس کس قسم کے حربے استعمال کرتے ہیں، اس کے لئے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں، یہ ہم سب کا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ لیکن قائدِاعظمؒ تو کسی اور ہی مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ انہیں اپنی ذات پہ کس قدر اعتماد تھا اور سستی شہرت حاصل کرنے سے کس قدر نفرت، اس کے لئے میں صرف ایک واقعہ کا تذکرہ کافی سمجھتا ہوں، جو ہے تو معمولی سا، لیکن اس میں حقیقت بہت بڑی پنہاں ہے۔ مسٹر جناح اسمبلی سیشن کے سلسلہ میں گرمیوں میں اکثر شملہ تشریف لایا کرتے تھے، لیکن جب وہ قائدِاعظمؒ کی حیثیت سے پہلی بار شملہ آئے تو مسلمانانِ شملہ نے ان کا تاریخی جلوس نکالنے کا فیصلہ اور اہتمام کیا۔ ریلوے سٹیشن سے وہ ایک کھلے رکشا میں سوار ہوئے کہ وہاں اسی سواری کی اجازت تھی، اور مال روڈ سے آگے بڑھے۔ مال روڈ پر تو سرکاری دفاتر تھے لیکن آگے جا کر ایک راستہ لوئر بازار کی طرف اُترتا تھا جہاں عوام کی آبادی تھی اور وہ ان کے انتظار میں چشم براہ تھے۔ قائدِاعظمؒ انگریزی لباس میں ملبوس تھے جو ان کا اس زمانے کا معمول تھا۔ اور ان کا سفید رنگ کا بڑا سا "ٹوپ" ان کے زانوؤں پر دھرا تھا۔ اس زمانے میں، انگریز دشمنی کی بنا پر انگریزی ٹوپی کو بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس مقام پر بعض دوستوں کے دل میں یہ خیال اُبھرا کہ لوئر بازار کے مسلمان اپنے رہنما کو پہلی بار دیکھیں گے - وہ متوقع ہوں گے کہ یہ راہنما "اسلامی لباس" میں ملبوس ہوگا۔ اسلامی لباس سے اُس زمانے میں مُراد شیروانی، شلوار، یا پاجامہ اور ترکی ٹوپی تھی - وہ جب انہیں اس لباس میں نہ

شملہ کا جلوس

دیکھیں گے تو ان پر کچھ اثر نہیں ہوگا۔ لیکن اس وقت اس سلسلہ میں ہو کیا سکتا تھا بعض احباب نے کہا کہ اور کچھ نہیں تو جناح صاحب سے کہا جائے کہ وہ کم از کم اپنے "ٹوپ" کو نیچے رکھ لیں تاکہ وہ نمایاں طور پر دکھائی نہ دے۔ اس جرأت مندانہ اقدام کے لئے قرعۂ فال مجھ دیوانے پہ پڑا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مجھے قائدِاعظمؒ سے شرفِ نیاز حاصل تھا۔ وقت کی کمی اور جذبات کی تیزی کی وجہ سے میں نے بھی اس اقدام کی نزاکت پر غور نہ کیا اور آگے بڑھ کر قائدِاعظمؒ کے کان میں یہ بات کہی۔ انہوں نے اسے سُنا، اور اگرچہ میں نے محسوس کیا کہ انہیں یہ مشورہ خوش نہیں آیا، انہوں نے اپنے مخصوص مشفقانہ انداز سے، میرے کان میں جو کچھ کہا اس کا ملخص یہ تھا کہ تم لوگ مجھے

مہاتما گاندھی بنا دینا چاہتے ہو۔ جناح ان سطحی حربوں سے پاپولر نہیں بننا چاہتا۔ اگر اس میں خلوص اور خدمت کی جاذبیت ہوگی تو یہ خود بخود مقبولِ انام ہو جائے گا۔ اگر یہ نہیں ہوگا تو اس طرح حاصل کی ہوئی ہر دل عزیزی ناپائدار ہوگی۔ ویسے ممکن تھا کہ میں اس ٹوپی کو نیچے رکھ دیتا۔ لیکن اب ایسا کرنا منافقت ہوگی جس کی کم از کم مجھ سے توقع نہ رکھو۔ یہ کہا اور اس ٹوپ کو زانوؤں سے اٹھا کر زیبِ سر کر لیا اور اسی ہیئت سے جلوس کے راستوں سے گذرے!!

مودودی مرحوم کی مخالفت

نیازی صاحب نے کہا تھا کہ "قائداعظمؒ کے خلاف بڑے بڑے جبّہ و دستار صف آرا تھے"۔ قدیمی صاحبانِ جبّہ و دستار کو تو چھوڑیئے۔ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) کو دیکھئے جو تحریکِ پاکستان اور قائداعظمؒ کے سب سے زیادہ مخالف تھے۔ اور انہوں نے اس تحریک کے دوران تازہ بتازہ "جبّہ و دستار" پہنا تھا۔ انہوں نے ۱۹۳۹ء میں اپنی تالیف بنام "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش، حصہ سوم" شائع کی تھی (حصہ سوم اور ۱۹۴۲ء ایڈیشن خاص طور پر یاد رکھیئے)۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا:-

> افسوس کہ لیگ کے قائداعظمؒ سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو (ص۳۲)۔ ایسے لوگوں کو محض اس لئے مسلمانوں کی قیادت کا اہل قرار دینا کہ وہ مغربی سیاست کے ماہر یا مغربی طرزِ تنظیم کے استاد فن ہیں اور اپنی قوم کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں سراسر اسلام سے جہالت اور غیر اسلامی ذہنیت ہے (ص۳۷) جن کی عملی زندگی میں اور جن کے خیالات، نظریات، طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی (ص۳۷)

حتّٰی کہ انہوں نے "حصولِ پاکستان کے بعد بھی قائداعظمؒ کو نہیں بخشا اور ترجمان القرآن کی پہلی پاکستانی اشاعت (بابت جون ۱۹۴۸ء) میں تحریکِ پاکستان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:-

> یہ بھوت ان سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلے ربع صدی میں ہمارے ملک کی سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی۔ (ص۱۵)

پھر اسی پرچہ کی اگست ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں لکھا:-

> اس پورے گروہ میں سے ایک کوئی بھی نکلا جو بازی کھونے کے بعد سدھر سکتا۔ یہ ساری جماعت بازیگروں سے پٹی پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب قلا بازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور

ا۔ قائداعظمؒ کو قرآن مجید کے ساتھ کس قدر والہانہ وابستگی تھی اور ان کا قرآنی مطالعہ کس قدر گہرا تھا اس کے لئے زیادہ نہیں تو کم از کم، طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ دو پمفلٹ۔ "قائداعظمؒ اور قرآن مجید" اور "کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟" ملاحظہ کر لئے جائیں۔

کھوکھلے اخلاق کا تماشا دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی۔ جس کے وہ نمائندے بنے ہوئے تھے۔

عوام میں مشہور ہے کہ ہر شہر میں ایک "قطب" ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ شہر محفوظ رہتا ہے۔ وہ نہ ہو تو شہر غضبِ الٰہی سے تباہ ہو جائے۔ اِن "صاحبانِ جبّہ و دستار" کی طرف نیازی صاحب نے اشارہ کیا ہے، ان میں (کم از کم) ایک "قطب" ضرور تھا۔ اور وہ تھے علامہ شبیر احمد عثمانی (علیہ الرحمۃ) —— جن کا اسمِ گرامی سامنے آتے ہی آنکھوں میں نورانیت اور قلب میں شادابی پیدا ہو جاتی ہے۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان میں کس قدر جلیل القدر خدمات سرانجام دیں اور خود اپنے حلقہ کی طرف سے مسلسل اور بے پناہ مخالفت کا کس استقامت سے مقابلہ کیا، یہ ایک الگ داستان ہے۔ سردست ہم ان کی وہ تقریر درج ذیل کرتے ہیں جس کے ساتھ انہوں نے ۹ مارچ ۱۹۴۹ء کو پاکستان کی مجلسِ دستور ساز میں 'قراردادِ مقاصد' پیش کی تھی۔ واضح رہے کہ قراردادِ مقاصد اور مسودہ دستورِ پاکستان پر طلوعِ اسلام میں تفصیلی تبصرہ شائع کیا گیا تھا۔ اس وقت ہم اس بحث کا اعادہ نہیں کر رہے۔ صرف علامہ علیہ الرحمۃ کی تقریر نقل کرنے پر اکتفا کر رہے ہیں جس میں اسلامی مملکت کے بنیادی خط و خال بڑی حد تک نمایاں کئے گئے ہیں۔

علامہ شبیر احمد عثمانی (علیہ الرحمۃ) کی تقریر

"جنابِ صدرِ محترم! قراردادِ مقاصد کے اعتبار سے جو مقدس اور مبارک تجویز آنریبل مسٹر لیاقت علی خان صاحب نے ایوانِ ہذا کے سامنے پیش کی ہے میں نہ صرف اس کی تائید کرتا ہوں بلکہ آج اس جیسی صدی میں (جب کہ ملحدانہ نظریاتِ حیات کی شدید کشمکش اپنے انتہائی عروج پر پہنچ چکی ہے) ایسی چیز کے پیش کرنے پر موصوف کی عزم و ہمت اور جرأتِ ایمانی کو مبارکباد دیتا ہوں۔

اگر غور کیا جائے تو یہ مبارکباد فی الحقیقت میری ذات کی طرف سے نہیں بلکہ اس پسی ہوئی اور کچلی ہوئی روحِ انسانیت کی جانب سے ہے جو خالص مادہ پرست طاقتوں کی حریفانہ حرص و آز اور رقیبانہ ہوس ناکیوں کے میدانِ کارزار میں مدتوں سے پڑی کراہ رہی ہے۔ اس کے کراہنے کی آوازیں اس قدر درد انگیز ہیں کہ بعض اوقات اس کے سنگدل قاتل بھی گھبرا اٹھتے ہیں۔ اور اپنی جارحانہ حرکات پر نادم ہو کر تھوڑی دیر کے لئے مداوا تلاش کرنے لگتے ہیں۔ مگر پھر علاج و دوا کی جستجو میں وہ اس لئے ناکام رہتے ہیں کہ جو مرض کا اصل سبب ہے، اسی کو دوا اور اکسیر سمجھ لیا جاتا ہے۔

یاد رکھئے! دنیا اپنے خود ساختہ اصولوں کے جس جال میں پھنس چکی ہے اس سے نکلنے

---

[1] حصولِ پاکستان کے بعد اس احسان فراموش قوم نے ان سے کس قسم کا سلوک کیا تھا۔ یہ ایک الگ افسانہ ہے۔

کے لئے جس قدر پھڑپھڑائے گی اسی قدر جال کے حلقوں کی گرفت اور زیادہ سخت ہوتی جائیگی وہ صحیح راستہ گم کر چکی ہے جو راستہ اب اختیار کر رکھا ہے اس پہ جتنے زور سے بھاگے گی وہ حقیقی فوز و فلاح کی منزل سے دور ہی ہوتی چلی جائے گی۔ ہمیں اپنے نظامِ حیات کو درست اور کامیاب بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارا انجن جس لائن پہ اندھا دھند چلا جا رہا ہے اسے تبدیل کریں، اور جس طرح بعض دفعہ لائن تبدیل کرتے وقت گاڑی کو کچھ پیچھے ہٹانا پڑتا ہے۔ ایسے ہی صحیح لائن پہ آنے کی غرض سے ہم کو پیچھے ہٹنا پڑے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ اگر ایک شخص کسی راستہ پہ بے تحاشہ دوڑ رہا ہے اور ہم دیکھیں کہ چند قدم آگے بڑھنے پہ وہ کسی ہلاکت کے غار میں جا پڑے گا تو ہم خاموش نہیں رہ سکتے۔ اسے ادھر سے پیچھے ہٹا کر صاف اور سیدھی شاہراہ پہ ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ یہی حال آج دنیا کا ہے اگر ہماری تنگی اور بے چین دنیا کو اپنے تباہ کن مصائب سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے تو اسے حالات کا بالکل جڑ بنیاد سے از سرِ نو جائزہ لینا ہوگا۔ کسی درخت کی شاخوں اور پتوں پر پانی چھڑکتے رہنا بے کار ہے۔ اگر اس کی جڑ جو سینکڑوں من مٹی کے نیچے دبی ہوئی ہے مضبوط نہ ہو۔ آج کے بہت سے بکھرے ہوئے مسائل خواہ ان سے آپ کو کتنی ہی دلچسپی اور شغف کیوں نہ ہو۔ کبھی ٹھیک طور پہ سنور اور سلجھ نہیں سکتے جب تک ان کے اصول بلکہ اصل الاصول درست نہ ہو جائیں۔ قدامت پرستی اور رجعت پسندی کے طعنوں سے نہ گھبرایئے بلکہ کشادہ دل و دماغ کے ساتھ ایک متجسس حق کی طرح الجھی ہوئی ڈور کا سرا پکڑنے کی کوشش کیجئے جو باتیں صاحبِ اقتدار اور ذی اقتدار قوموں کے زبردست پروپیگنڈا یا غیر شعوری طور پہ ان کے حاکمانہ اقتدار اور مسحور کن مادی ترقیات کے زور و اثر سے بطور مسلمات عامہ، اصول موضوعہ اور مفروضہ تنہا صداقتوں کے تسلیم کر لی گئی ہیں۔ ان ہی پر تجدید فکر و نظر کی ضرورت ہے۔ اس پکے ارادے کے ساتھ کہ جن پہ صدیوں کی کاوشوں کے نتیجہ میں اعتقاد جمائے بیٹھے تھے۔ دعوئے حق کے بعد ایک لمحہ کے لئے اس پر قائم رہنا ہم جرمِ عظیم سمجھیں گے اگر دنیا کو انسانیت کی حقیقی فلاح کے لئے کسی نتیجہ پہ پہنچنا ہے تو اسے ان قدیم اور ان نظریات پر ضرور غور کرنا ہوگا جنہیں مادی و معاشی مسابقت کی بے تحاشہ دوڑ میں بہت سی قومیں پیچھے چھوڑ آئی ہیں اسے یوں خیال کیجئے کہ کئی صدیوں تک سکونِ ارض کے متعلق بطلیموس کا نظریہ دنیا پہ مستولی رہا۔ فیثاغورث کی آواز پہ کسی نے توجہ نہ دی۔ پھر ایک وقت آیا کہ ہزاروں من مٹی کے نیچے دبا ہوا بیج جو فیثاغورث دبا گیا تھا زمین کے سینے کو چاک کر کے باہر نکلا اور برگ و بار لا کر رہا۔ سچائی کا پرستار کبھی اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ کسی زمانہ میں یا طول عرصہ تک لوگ اس کے ماننے سے آنکھیں چرائیں گے یا ناک بھوں چڑھائیں گے۔ حق اکیلا رہ کر بھی حق ہی رہتا ہے۔ اسے یقین ہے کہ ایک دن ضرور آئے گا کہ جب اس کے جھٹلانے والے زمانہ کے دھکے کھا کر اسی کے دامن میں پناہ لینے پہ مجبور ہوں گے۔

پاکستان روشنی کا مینار

آج وہ دن قریب آ رہا ہے اور جیسا کہ آنریبل جناب لیاقت علی خاں نے فرمایا۔ روشنی کی تحریک افق پہ ظاہر ہو کر طلوع ہونے والے روزِ روشن کا پیش

ضمیمہ بن رہی ہے، ضرورت ہے کہ ہم اپنے آپ کو خفاش صفت پیدا نہ کریں جو دن کی روشنی کو دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتی۔ پاکستان مادیت کے بھنور میں پھنسی ہوئی اور دہریت و الحاد کی اندھیریوں میں بھٹکی ہوئی دنیا کو روشنی کا ایک مینار دکھانا چاہتا ہے۔ یہ دنیا کے لئے کوئی چیلنج نہیں، بلکہ انسانیت کے لئے پُر امن پیغام حیات و نجات ہے اور اطمینان اور خوش حالی کی راہ تلاش کرنے والوں کے لئے سہولت مہیا کرتا ہے

حاکم حقیقی کون ہے ؟

ہمارا غیر متزلزل عقیدہ ہے کہ دُنیا کے لئے عموماً اور پاکستان کے لئے خصوصاً کسی قسم کا نظام تجویز کرنے سے پہلے پوری قطعیت کے ساتھ یہ جان لینا ضروری ہے کہ اس تمام کائنات کا جس میں ہم سب اور ہماری یہ مملکت بھی شامل ہے۔ مالک اصلی اور حاکم حقیقی کون ہے؟ اور ہے یا نہیں؟ اب اگر ہم اس کا مالک کسی خالق اکمل اور مقتدر اعلےٰ ہستی کو مانتے ہیں (جیسا کہ میں خیال کرتا ہوں کہ اس ایوان کے تمام ارکان و اعضاء کا یہ عقیدہ ہوگا) تو ہمارے لیئے یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہوگا کہ کسی مالک کا خصوصاً اس مالکِ علیٰ الاطلاق کی ملک میں ہم اسی حد تک تصرف کرنے کے مجاز ہیں جہاں تک کہ وہ اپنی مرضی سے ہمیں اجازت دے دے۔ ملکِ غیر میں کوئی غاصبانہ تصرف ہمارے لئے جائز نہیں ہو سکتا۔ پھر ظاہر ہے کہ کسی مالک کی اجازت و مرضی کا علم اس کے بتلانے ہی سے ہو سکتا ہے۔ سو اللہ تعالےٰ نے پیغمبر اسی لئے بھیجے اور وحی ربانی کا سلسلہ اسی لئے قائم کیا کہ انسانوں کو اس کی مرضی اور اجازت کے صحیح حدود معلوم کرا دیئے جائیں اسی نقطۂ خیال کے پیش نظر دیزولیوشن میں اس کے مقرر کردہ حدود کے اندر کے الفاظ رکھے گئے ہیں اور یہی وہ بنیادی نقطہ ہے جہاں سے دینی اور خالص مادی حکومتوں کی ڈانڈیں ایک دوسرے سے الگ ہو جاتی ہیں

یہ نظریہ کہ دین و مذہب کا تعلق انسان اور اس کے مالک سے ہے بندوں کے باہمی معاملات سے اسے کچھ سروکار نہیں نہ سیاست میں اس کا کوئی دخل ہے، اسلام نے کبھی تسلیم نہیں کیا ممکن ہے دوسرے مذاہب جو آج کل دنیا میں موجود ہیں ان کے نزدیک یہ نظریہ درست ہو اور وہ خود کسی جامع و عادی نظام حیات سے تہی دامن ہوں مگر جہاں تک اسلام کا تعلق ہے ایسے تصور کی اس میں کوئی گنجائش نہیں بلکہ اس کی تمام تر تعلیمات اس باطل تصور کی دشمن ہیں۔

قائد اعظمؒ کی تصریحات

قائد اعظمؒ نے اگست ۱۹۴۴ء میں گاندھی جی کے نام جو خط لکھا تھا اس میں لکھتے ہیں :-

> قرآن مسلمانوں کا ضابطۂ حیات ہے اس میں مذہبی اور مجلسی، دیوانی اور فوجداری، عسکری اور تعزیری، معاشی اور معاشرتی غرض کہ سب شعبوں کے احکام موجود ہیں۔ مذہبی رسوم سے لے کر روزانہ کے امورِ حیات تک، روح کی نجات سے لے کر جسم کی صحت تک۔ جماعت کے حقوق سے لے کر فرد کے حقوق و فرائض تک، دنیوی زندگی میں جزا و سزا تک، ہر فعل، قول اور حرکت پر مکمل احکام کا مجموعہ ہے۔ لہٰذا میں جب یہ کہتا ہوں کہ مسلمان ایک قوم ہے، تو

حیات و ما بعد حیات کے ہر معیار اور ہر مقدار کے مطابق کہتا ہوں۔

ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآنی تعلیمات محض عبادات و اخلاقیات تک محدود نہیں بلکہ قرآن کریم مسلمانوں کا دین و ایمان اور قانونِ حیات ہے۔ یعنی معاشرتی، تجارتی، تمدنی، عسکری، عدالتی اور تعزیری احکام کا مجموعہ ہے۔ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم کو یہ حکم ہے کہ ہر مسلمان کے پاس اللہ کے کلام پاک کا ایک نسخہ ضرور ہو اور وہ اس کو بغور و خوض مطالعہ کرے تاکہ یہ اس کی انفرادی و اجتماعی ہدایت کا باعث ہو۔"

قائد اعظمؒ نے ان خیالات و عزائم کا بار بار اظہار کیا ہے۔ کیا ایسی واضح اور مکرر تصریحات کے بعد کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ سیاست و حکومت، مذہب سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی یا یہ کہ اگر آج قائد اعظمؒ زندہ ہوتے تو یہ تجویز مقاصد پیش نہیں ہو سکتی تھی۔

قرآن حکیم میں صاف صاف ارشاد ہے۔

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝ اور وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُونَ ۝ .... هُمُ الظّٰلِمُونَ ۝ .... هُمُ الْفٰسِقُونَ ۝ (۴۴، ۴۵، ۴۷)

اسلامی حکومت کا مفہوم

اس موقع پر یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام میں دینی حکومت کے معنی "پاپائیت" یا "کلیسائی حکومت" کے نہیں، بھلا جس بت کو قرآن نے اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ کہہ کر توڑا ہے کیا وہ اس کی پرستش کو جائز رکھ سکتا ہے؟

اسلامی حکومت سے مراد وہ حکومت ہے جو اسلام کے بتائے ہوئے اعلیٰ اور پاکیزہ اصول پر چلائی جائے اس لحاظ سے وہ ایک خاص قسم کی اصولی حکومت ہوگی۔ ظاہر ہے کہ کسی اصولی حکومت کو چلانا خواہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی (جیسے روس کی اشتراکی حکومت) دراصل ان ہی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو ان اصولوں کو مانتے ہوں۔ جو لوگ ان اصولوں کو نہیں مانتے ایسی حکومت انتظامِ مملکت میں ان کی خدمات تو ضرور حاصل کر سکتی ہے۔ مگر مملکت کی جنرل پالیسی یا کلیدی انتظام کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں نہیں چھوڑ سکتی۔

اسلامی حکومت اصل سے انسانی حکومت نہیں بلکہ نیابتی حکومت ہے۔ اصل حاکم خدا ہے انسان زمین پر اس کا خلیفہ (نائب) ہے جو حکومت در حکومت کے اصول پر دوسرے مذہبی فرائض کی طرح نیابت کی ذمہ داریوں کو بھی خدا کی مقرر کردہ حدود کے اندر پورا کرتا ہے۔[1]

مکمل اسلامی حکومت، حکومت راشدہ ہوتی ہے۔ لفظ "رشد" حکومت کے انتہائی اعلیٰ معیارِ حسن و خوبی کو ظاہر کرتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت، حکومت کے کارکن، اور مملکت کے عوام کو نیکوکار ہونا چاہئے۔

---

[1] انسان خدا کا خلیفہ نہیں۔ وہ انسانوں کو دنیا میں احکام خداوندی کو نافذ کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ (طلوعِ اسلام)

قرآن نے حکومت اسلامی کی یہی غرض و غایت قرار دی ہے کہ وہ انسانوں کو اپنے دائرہ اقتدار میں نیکیوں کا حکم دے اور برائیوں سے روکے۔ اسلام آج کل کی سرمایہ پرستی کے خلاف ہے۔ اسلامی حکومت اپنے خاص طریقوں سے جو اشتراکی طریقوں سے الگ ہیں۔ جمع شدہ سرمایہ کی مناسب تقسیم کا حکم دیتی ہے۔ اس کو دائر و سائر رکھنا چاہتی ہے مگر اس کام کو اخلاقی و نیز قانونی طریقہ پر عام خوش دلی عدل و اعتدال کے ساتھ کرتی ہے۔ اسلامی حکومت شخصی ملکیت کی نفی نہیں کرتی[1] مناسب حد تک راس المال رکھنے کی اجازت دیتی ہے۔ زائد سرمایہ کے لئے ملی بیت المال قائم کرتی ہے جس میں سب کے حقوق مشترک ہیں اور اس سرمایہ کی تقسیم سے سرمایہ اور افلاس کے درمیان توازن اور اعتدال کو بحال رکھتی ہے۔

اسلام اور جمہوریت

شوریٰ اسلامی حکومت کی اصل ہے (وامرھم شوریٰ بینھم)۔ اسلامی حکومت دنیا میں پہلا ادارہ ہے جس نے شہنشاہیت کو ختم کر کے استصواب رائے عامہ کا اصول جاری کیا اور بادشاہ کی جگہ عوام کے انتخاب کردہ امام (قائد حکومت) کو عطا کی۔ محض توریث یا جبر و استبداد کے راستوں سے بادشاہ بن بیٹھنا اسلام کے منشا، کے سراسر خلاف ہے۔ وہ جمہور کی مرضی اور ان ہی کے ہاتھوں سے اسٹیٹ کو اختیار دلاتا ہے وہ انہیں یہ حق نہیں دیتا کہ وہ امارت کی کوئی تنظیم نہ کریں اور اقتدار اپنے ہی پاس روک کر انتشار و ابتری اور طوائف الملوکی پھیلا دیں۔ یہ اولیت کا ایسا شرف ہے جو اسلامی حکومت کو دنیا کی تمام جمہوریتوں پر حاصل ہے۔

اسلامی سلطنت کا بلند ترین منتہائے خیال یہ ہے کہ سلطنت کی بنا جغرافیائی، نسلی، قومی، حرفتی اور طبقاتی قیود سے بالاتر ہو کر انسانیت اور ان اعلیٰ اصولوں پر ہو جن کی تشیید و تشکیل کے لئے وہ قائم کی جاتی ہے۔

اسلامی حکومت پہلی حکومت ہے جس نے اس منتہائے خیال کو پورا کرنے کے لئے اپنی خلافت راشدہ کی بنیاد انسانیت رکھی۔ یہ حکومت اپنے کاموں میں رائے عامہ، مساوات، حقوق، آزادی ضمیر اور سادگی کا امکانی حد تک خیال رکھتی ہے۔

اسلام اور اقلیتیں

اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ اپنے قلمرو میں رہنے والے تمام غیر مسلموں سے جو شرائط طے ہوئے ہوں (جان، مال، آبرو، مذہبی آزادی اور عام شہری حقوق) کی پوری حفاظت کرے۔ اگر کوئی طاقت ان کے جان و مال وغیرہ پر دست اندازی کرے تو حکومت اس سے جنگ کرے اور ان پر کوئی ایسا بھار نہ ڈالے جو ان کے لئے ناقابل تحمل ہو۔ جو ملک صلحاً حاصل ہوا ہو۔ وہاں کے غیر مسلموں سے جو شرائط طے ہوں ان کی پوری پوری پابندی کی جائے۔ پھر غیر مسلموں کے یہ حقوق محض اکثریت کے رحم و کرم پر نہیں بلکہ خدا کا عائد کیا ہوا ایک فرض ہے جس سے کسی وقت بھی انحراف جائز نہیں۔

پاکستان کے اسلامی تشخص پر اعتراض کا جواب

اس کے بعد دینی حکومت کی مزعومہ خرابیوں کا جہاں تک تعلق ہے۔ جواب میں اتنا کہنا کافی

---

[1] قرآن کے معاشی نظام کے متعلق ہم بکثرت لکھ چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں پرویز صاحب کی کتاب نظام ربوبیت بڑی اہم ہے۔
(طلوع اسلام)

ہو گا کہ علم و تحقیق کی روشنی میں موجودہ ترقی یافتہ حکومتوں کے طور طریقوں کو خلفائے اربعہ کے بے داغ عہد حکومت کے مقابلہ میں رکھ کر مفادِ عامہ کے لحاظ سے وزن کر لیا جائے۔ آج ظلم و جبر، عہد شکنی، مالی دست برد، کشت و خون، بربادی و ہلاکت، انسانی جماعتوں کی باہمی دشمنی، افراد کی عدم مساوات اور جمہور کے حقوق کی پامالی کی جو مثالیں دوربین سے دیکھے بغیر نظر آ رہی ہیں۔ خلفاء کے ترقی یافتہ عہد میں اس کا خفیف سا نشان بھی نہ ملے گا۔ غرضیکہ بیان کردہ خرابیاں مذہبی طرزِ حکومت کی خرابیاں نہیں ہیں بلکہ ان انسانی گمراہیوں سے اخذ کی گئی ہیں جنہوں نے خالص مادی طرزِ حکومت کی داغ بیل ڈالی ہے میں سمجھتا ہوں کہ گاندھی جی نے اسی نقطہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جب ۱۹۳۷ء میں آپ نے کانگریسی وزراء کو یہ ہدایات دیں کہ تم ابوبکرؓ اور عمرؓ کی سی حکومت قائم کرو۔ نیز قائد اعظمؒ نے دستور کی اسی اساس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جب ۱۹۴۳ء میں بمقام جالندھر آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے خیال میں مسلمانوں کا طرزِ حکومت آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل قرآن حکیم نے فیصلہ کر دیا تھا۔

انہوں نے نومبر ۱۹۴۵ء میں پیر صاحب مانکی شریف کے نام جو خط لکھا تھا اس میں صاف صاف لکھ دیا تھا کہ "اس بات کے کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ قانون بنانے والی جماعت جس میں بہت زیادہ اکثریت مسلمانوں کی ہو گی۔ پاکستان کے لئے ایسے قانون بنا سکے گی جو اسلامی قانون کے خلاف ہو اور نہ ہی پاکستانی غیر اسلامی قانون پر عمل کر سکیں گے۔" اس قسم کے اعلانات قیام پاکستان سے پہلے قائد اعظمؒ اور دوسرے زعماء لیگ کی طرف سے برابر ہوتے رہے جن کا بخوف طوالت استیعاب نہیں کر سکتے۔

بہرحال ان بیانات کے پڑھنے کے بعد کسی مسلم یا غیر مسلم کو ہمارے مقاصد اور مطمح نظر کو سمجھنے میں کوئی ابہام و اشتباہ نہیں رہ سکتا اور جس قدر آئین و نظام اسلامی کے متعلق بطور اعتراض آج کہی جا رہی ہیں ان سب کے سوچنے کا وقت وہ تھا جب پوری صراحت کے ساتھ یہ اعلانات کئے جا رہے تھے جب یہ سب کچھ جان کر اور سمجھ کر دوسری قوم نے تقسیم ہند کے فیصلہ پر دستخط کئے اور پاکستان کی اقلیت نے ان مقاصد کو مانتے ہوئے ہمارے ساتھ اشتراکِ عمل کیا۔

اب پاکستان قائم ہونے کے بعد اس نقطۂ نظر سے انحراف کی کوئی وجہِ جواز ان کے پاس موجود نہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ انڈین یونین کا قیام تو ہندو اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی مخلوط مساعی سے عمل میں آیا ہے لیکن پاکستان کا حصول خالص مسلم قوم کی مساعی اور قربانیوں کا رہینِ منت ہے اور ان کی قومی خصائص و ممیزات کے تحفظ کا داعیہ اس کا محرک ہوا ہے۔ اب اگر ایسی سیدھی اور صاف بات کو بھی جھٹلا دیا جائے تو اس کا علاج ہمارے پاس نہیں[3]۔

سرمایہ پرستی اور کمیونزم کا جواب

اس موقع پر بھی یہ بات فراموش نہ کیجئے کہ آج دنیا میں

---

[3] اُس زمانے میں غیر مسلم اقلیتوں کے تحفظ کے سلسلہ میں پاکستان کے خلاف بڑا پروپیگنڈہ کیا جاتا تھا۔ (طلوع اسلام)

معاشی اختلال اور اقتصادی عدم توازن کی وجہ سے ملحدانہ اشتراکیت (کمیونزم) کا سیلاب ہر طرف سے بڑھتا چلا آرہا ہے اس کا صحیح اور اصولی مقابلہ اگر دنیا میں کوئی نظام کرسکتا ہے تو وہ صرف اسلام کا اقتصادی نظام ہے۔ اگر ہم پاکستان یا عالمِ اسلامی کو اس بھیانک خطرہ سے بچانا چاہتے ہیں تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ پاکستان میں صحیح اسلامی نظام کا اعلان و آغاز کریں۔ اور تمام اسلامی ممالک کو اسلام کے نام پہ اس کی دعوت دیں۔ اگر اس طرح تمام اسلامی ممالک آئینی طور پہ متحد ہوگئے تو قدرتی طور پہ وہ وحدتِ اسلامی قائم ہوجائے گی جس کی ہم سب مدّت سے آرزو رکھتے ہیں اور جو اشتراکیت، سرمایہ پرستی دونوں کی روک تھام کے لئے مضبوط آئینی دیوار کا کام دے گی۔

موجودہ نظام اور اسلام

بہت سے لوگوں کو یہ خیال گذرتا ہے کہ ابھی ہمارا کاروبار جس ڈگر پہ چل رہا ہے اسلامی نظام اور اسلامی آئین کا اعلان کرکے ہم اسے ایک دم کیسے بدل سکتے ہیں، یہ تو ہمارے اجتماعی حالات میں ایسا انقلاب عظیم ہوگا جو ہماری قومی زندگی کی کایا پلٹ دے گا، اور جس کے لیے ہمیں جدید کانسٹی ٹیوشن کے چلانے کے لئے کثیر تعداد میں مناسب رجالِ کار تیار کرنے پڑیں گے اور بہت طویل عرصہ درکار ہوگا۔

میں کہتا ہوں کہ ان کا خیال ایک حد تک صحیح ہے لیکن اسلامی نظام کا مطالبہ کرنے والے بھی اسے بخوبی محسوس کرتے ہیں۔ اسلامی آئین و نظام کے اعلان سے غرض یہ ہے کہ مملکت کا اصلی نصب العین اور اس کی انتہائی منزلِ مقصود واضح اور مستحضر ہوجائے تاکہ اس کی روشنی میں ہمارا جو قدم اٹھے وہ ہم کو آخری منزل سے قریب تر کرنے والا ہو۔ یہ کام ظاہر ہے کہ بتدریج ہوگا اور بتدریج ہی ہوسکتا ہے۔ جو کام فی الحال کئے جا سکتے ہیں وہ فوراً کرنے ہوں گے اور جن کاموں کے لئے سردست حالات سازگار نہیں وہ فوراً نفاذ پذیر نہ ہوں گے۔ بلکہ حکیمانہ اسلوب پہ حالات کو سازگار بنانے کی ہر امکانی کوشش عمل میں لائی جائے گی۔ بہرحال انسان اسی چیز کا مکلف ہے جس کی وہ استطاعت رکھتا ہے۔ یہی وہ بات ہے جو میں تقسیم سے قبل اپنے مختلف بیانات، خطبات میں کھول کر کہہ چکا ہوں چنانچہ خطبۂ لاہور میں میں نے عرض کیا تھا کہ یہ ہمیں اسی طرح اعلیٰ اور پاک نصب العین سے قریب تر کرے گا۔ جس طرح رات کی تاریکی آہستہ آہستہ کم ہوتی اور دن کی روشنی بتدریج پھیلتی ہے یا جس طرح ایک پرانا مریض دھیرے دھیرے صحت کی طرف قدم اٹھاتا ہے۔ دفعتاً و بغتاً بیماری سے چنگا نہیں ہوجاتا اسی طرح پاکستان ہماری قومی صحت اور ہماری مکمل ترین آزادی کے نصف النہار کی طرف تاریکی قدم اٹھائے گا۔

حرفِ آخر

جناب صدر محترم! آخر میں ایوانِ ہٰذا کے معزز ممبران کی خدمت میں میں عرض کروں گا کہ اس ڈھیلے ڈھالے ریزولیوشن سے گھبرانے اور وحشت کھانے کی کوئی وجہ نہیں اسلامی فرقوں کے اختلافات تحریکِ پاکستان کی برکت سے بہت کم ہوچکے ہیں اور اگر کچھ باقی ہیں تو انشاء اللہ برادرانہ مفاہمت سے صاف ہوجائیں گے۔ کیونکہ تمام اسلامی فرقے اور ملک آج اسلامی نظام کی ضرورت کو بہت شدت کے ساتھ محسوس کر رہے ہیں اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارے غیر مسلم دوست

(باقی صفحہ ۶۲ پر ملاحظہ فرمائیں)

سلیم کے نام

(تعلیم وتربیت کا انوکھا لیکن بڑا مؤثر انداز)

قوم پر جب چاروں طرف سے مایوسی کی گھٹائیں چھا رہی تھیں، تو علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو نمایاں کیا کہ قوموں کا مستقبل ان کی ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اگر ان کی تعلیم و تربیت صحیح خطوط پر ہو جائے تو وہ قوم کو پستیوں کے گڑھوں سے نکال کر ارتقا کی منزلوں کی طرف لے جا سکتی ہیں، چنانچہ انہوں نے اپنے پیغامِ حیات آور کا اولیں مخاطب قوم کے نوجوانوں کو قرار دیا۔ دیکھئے وہ کس درد و سوز سے بدرگاہِ ربّ العزت اپنی اس آرزو کا اظہار کرتے ہیں کہ ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا! آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے

پھر عرض پرداز ہیں کہ ؎

خرد کو غلامی سے آزاد کر! — جوانوں کو پیروں کا استاد کر!

اور اسی ساقی نامہ کا اختتام ان دعاؤں کے ساتھ کرتے ہیں کہ ؎

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر — زمینوں کے شب زنده داروں کی خیر!
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے — مرا عشق میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں — مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں!
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز — مری خلوت و انجمن کا گداز!
امنگیں مری، آرزوئیں مری — امیدیں مری، جستجوئیں مری!
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر!

مرے قافلے میں لٹا دے اسے!
لٹا دے، ٹھکانے لگا دے اسے

وہ انہی تمناؤں، آرزوؤں، دعاؤں کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئے تو ان کی ہم نوائی کا فریضہ پرویز صاحب نے اپنے اوپر عائد کر لیا۔ چنانچہ وہ اس وقت سے لے کر آج تک، مختلف انداز و اسالیب سے

نوجوانانِ ملت کو مخاطب کئے چلے آرہے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ دلکش اور مؤثر وہ اسلوب ہے جسے وہ "سلیم کے نام خطوط" کے عنوان سے تعبیر کرتے ہیں۔ "سلیم" عصرِ حاضر کا ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے جو سینے میں قلبِ سلیم رکھتا ہے لیکن ہمارے مروّجہ مذہب کے نا قابلِ فہم اور نا قابلِ اطمینان عقائد اور رسوم اس کے ذہن میں ایسے شکوک و شبہات پیدا کرتے ہیں جن سے وہ ہدفِ اضطراب بن جاتا ہے۔ وہ ان شکوک کو لے کر پرویز صاحب کے ہاں آتا ہے۔ وہ ایسی شفقت اور دلجوئی، اور اس کے ساتھ دلائل و براہین کی مدد سے ان شکوک کا ازالہ کرکے، دین کی حقیقت سمجھاتے ہیں کہ وہ سکون و اطمینان کی جنت اپنے قلب و دماغ میں لے کر واپس جاتا ہے۔ یہ تھا وہ انداز جسے انہوں نے "سلیم کے نام خطوط" کے عنوان سے پیش کیا تھا۔ انہوں نے اس سلسلہ کا آغاز (علامہ اقبالؒ کی وفات کے تھوڑے عرصہ بعد) ۱۹۳۹ء میں کیا تھا، اور یہ اس قدر پھیلتا گیا کہ ادارہ کی طرف سے اسے تین جلدوں میں شائع کیا گیا۔ طلوعِ اسلام کی نومبر ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں اس کا جو اشتہار شائع ہوا تو جو قارئین اس سے ابھی تک نا آشنا تھے انہوں نے مزید تفاصیل معلوم کرنا چاہیں۔ اس کے لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس سلسلہ کا پہلا خط شائع کر دیا جائے جس سے اس کی ندرت، افادیت اور اندازِ بیان کی شگفتگی سامنے آجائے گی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر (زیادہ نہیں تو کم از کم) ان خطوط ہی کو ہمارے نصابِ تعلیم میں شامل کر دیا جاتا تو ہمارے طالب علم الحاد، بے دینی اور سیکولرازم کے آغوش میں جانے سے بچ جاتے۔ لیکن جس معاشرہ پر قدامت پرستی مسلط ہو، اس میں قرآنی فکر کس طرح بار پا سکتی ہے؟

اب آپ "سلیم کے نام پہلا خط" ملاحظہ فرمائیے جو نومبر ۱۹۳۹ء میں لکھا گیا تھا..... آپ دیکھیں گے کہ وہ لکھا تو گیا تھا آج سے (۴۳) سال پہلے لیکن وہ اب بھی اسی طرح تر و تازہ اور شگفتہ و شاداب ہے اور ہمارے موجودہ حالات پر بھی اسی طرح منطبق ——— پرویز صاحب کی تحریروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ نہ کبھی پرانی ہوتی ہیں، اور نہ ہی ان میں کہیں تضاد واقعہ ہوتا ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں، قرآن کریم کی روشنی میں لکھتے ہیں اور قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ اس کے حقائق کبھی پرانے نہیں ہوتے۔ نہ ہی اس میں ..... کسی قسم کا تضاد و تخالف ہے۔ اس کی ابدیت کا تو یہ عالم ہے کہ ؎

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست
عصر ہا پیچیدہ در آناتِ اوست!

اس کی آیات میں سینکڑوں تازہ جہان پوشیدہ ہیں۔ اس کی ایک ایک آیت میں زمانوں کے زمانے لپٹے ہوئے ہیں۔ لہٰذا، جس قلم کو قرآن کی تائید حاصل ہوگی، وہ کبھی کہنہ و فرسودہ نہیں ہوگی ——— وہ "زندہ رود" ہوتی ہے۔

———— (۰) ————

سلیمؔ کے نام پہلا خط

ہماری نمازیں اور روزے کیوں بے نتیجہ رہتے ہیں

سلیم! میرے مضامین پڑھ کر جو خیالات تمہارے دل میں پیدا ہوئے وہ بالکل فطری ہیں اور ہر اس شخص کے دل میں پیدا ہونے چاہئیں جو قرآنِ کریم کا خالی الذہن ہو کر مطالعہ کرتا ہے اور جس کی نگاہ ان حقائق کی متلاشی ہوتی ہے جنہیں خدا نے اس کتابِ مبین میں بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے اور جو قوموں کی تباہی و بربادی اور عروج و فلاح کے لئے غیر متبدل اور اٹل قوانین ہیں۔ تم میرے مسلک سے واقف ہو۔ میں قرآن کو مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ تمام نوعِ انسان کی انفرادی اور اجتماعی مشکلات کا واحد حل اور زندگی کے مصائب و آلام کا حتمی علاج سمجھتا ہوں۔ اور میرا یہ عقیدہ محض خوش فہمی پر مبنی نہیں بلکہ میں علیٰ وجہ البصیرت اس کا یقین رکھتا ہوں، ایسا یقین جو وجہ اطمینانِ قلب اور باعثِ تسکینِ روح ہوا کرتا ہے، نہ کہ توہم پرستی کا پیدا کردہ فریب نفس جسے یقین اور اطمینان کا نام دے دیا جاتا ہے۔

تم پوچھتے ہو، اور ایسا پوچھنے میں تم حق بجانب ہو، کہ جب مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد آج نماز بھی پڑھتی ہے۔ روزے بھی رکھتی ہے۔ زکوٰۃ بھی دیتی ہے۔ حج کا فریضہ بھی ادا کرتی ہے۔ تو ان اعمال کا وہ نتیجہ مرتب کیوں نہیں ہوتا جو عہدِ محمدٌ رسول اللہ والذین معہٗ (حضورؐ نبی اکرم اور صحابہؓ کے عہد) میں ہوتا تھا۔ چونکہ تم فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقیانہ اصطلاحات میں الجھنے کے عادی نہیں، اور نہ ہی یہ طریق ان حقائق کو سمجھنے کے لئے چنداں مفید ہوتا ہے، اس لئے تمہیں کھلے کھلے الفاظ میں بتانا چاہتا ہوں کہ آج ہمارے یہ "اعمالِ حسنہ" کیوں بے نتیجہ رہتے ہیں۔

سلیم! ذرا غور کرو کہ جاڑے کا موسم ہے۔ سخت سردی کا دن۔ شام کے قریب، جبکہ آفتاب کی شعاعوں میں تمازت باقی نہیں رہی، رحمت کی بیوی اپنے خورد سال بچے کو لے کر اپنی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بیٹھی ہے۔ رحمت کی بیوی کو تم جانتے ہو؟ تم بچپن میں ان کے ہاں کھیلنے جایا کرتے تھے۔ عمر کا تقاضا تھا کہ اس کے چہرے پر شگفتگی و شادابی ہوتی۔ لیکن مسلسل فاقوں نے اسے ایسی افسردگی اور پژمردگی میں بدل دیا تھا کہ وہ ایک اجڑا ہوا بہشت معلوم ہوتا تھا جس پر سوائے نورِ عصمت کے (جو ہر ایسی پاک دامن بی بی کے چہرے پر ہونا چاہیئے) رونق اور زندگی، تازگی اور بشاشت کا کوئی نشان تک باقی نہ تھا۔ وہ اپنے بچوں کو لے کر چولھے کے پاس آ بیٹھی۔ خشک ٹہنیاں،.... سوکھے پتے خس و خاشاک، دوپہر کو اکٹھا کر لائی تھی۔ انہیں سلگا دیا تاکہ بچے آگ تاپتے رہیں۔ لیکن بچوں کو تو سردی سے زیادہ بھوک ستا رہی تھی۔ اس نے ان کے پیہم معصوم تقاضوں سے مجبور ہو کر ہنڈیا میں خالی پانی ڈال کر چولھے پر چڑھا دیا اور یوں، ان ننھے بچوں کو نہیں! خود اپنے آپ کو فریب دے لیا۔

ہر آہٹ پر کان اور ہر جنبش پر نگاہ تھی۔ بچے اور ان کی ماں رہ رہ کر گلی کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ سورج ڈوب گیا تو گلی کے دوسرے کنارے سے رحمت آتا دکھائی دیا۔ ننگے پاؤں، پنڈلیاں گرد و غبار سے اٹی ہوئیں، گھٹنوں تک پرانا تہمد، پھٹا ہوا گاڑھے کا کرتا جس کی آستینیں بوسیدہ ہونے کی وجہ سے کہنیوں تک چڑھا رکھی تھیں۔ بس، اس شدت کے جاڑے میں یہی کل کائنات۔ چہرے پر زردی چھائی ہوئی۔ ہونٹوں پہ پیپڑیاں جمی ہوئیں۔ گھر کی طرف قدم اٹھاتا، لیکن قدم بمشکل اٹھتا۔ دروازے کے قریب آیا تو بیوی نے خاموشی سے بسم اللہ کہہ کر استقبال کیا۔ دونوں بچے ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ بیوی نے ایک حسرت بھری نگاہ میاں کے افسردہ چہرے پر ڈالی۔ اس کی غم آلود آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ مجھے تو آج بھی کہیں مزدوری نہیں ملی۔ دن بھر ادھر ادھر پھرتا، لوگوں کی منتیں خوشامدیں کرتا رہا لیکن کوئی کام نہ مل سکا۔

عین اس وقت سامنے کی مسجد میں خواجہ صاحب کی طرف سے دو ہزار روپے کا گراں بہا قالین بچھایا جا رہا تھا اور نمازی اسلام کی شوکت و عظمت پر ایک دوسرے کو مبارکباد اور خواجہ صاحب کو جنت کی بشارتیں دے رہے تھے۔

———(٥)———

سلیم! تم عنایت اللہ کو جانتے ہونا! وہ تمہارے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔ کس قدر ذہین اور کیسا شریف بچہ تھا، لیکن بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس کی ماں دن بھر محنت مزدوری کرتی اور بچہ کی پرورش کا سامان مہیا کرتی۔ لیکن جب مزدوری مردوں کو نہ مل سکے تو عورتوں کو مزدوری کہاں سے ملے؟ میں نے اپنی کھڑکی سے دیکھا کہ صبح مدرسے جاتے وقت ماں نے بچہ کو چھاتی سے لگایا! آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ لیکن دل کڑا کر کے بیٹے کو تسلی دی کہ مدرسے ہو آؤ۔ بس تمہارے آنے پر روٹی تیار ملے گی۔ میں ابھی پکاتی ہوں۔ جاؤ میرا بیٹا! خدا حافظ!

سلیم! اگر ہمت ہو تو اس ماں کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھو کہ بیٹے کو یوں بھوکا مدرسے بھیجتے وقت اس کے سینے میں کس قیامت کے جذبات غم و حزن کا طوفان بپا ہوگا۔ وہ عسرت و فلاکت کا سرچشمہ چپکے سے مدرسے چلا گیا۔ شام کو آیا۔ ماں گھر پر نہ تھی۔ شاید دانستہ باہر چلی گئی ہوگی کہ بھوکے بیٹے کو کس طرح دیکھ سکے؟ عنایت اللہ نے اندر آکر سب سے پہلے روٹی والے رومال کو کھولا تو اس میں کچھ نہ تھا۔ خاموشی باہر چلا گیا۔ گلی میں سے گزر رہا تھا کہ سامنے خان صاحب کے مکان میں سینکڑوں مسلمانوں کا اجتماع تھا۔ متنوع پھل۔ قسم قسم کی مٹھائیاں میزوں پر چنی رکھی تھیں کہ آج خان صاحب کے بچے کی پہلی افطاری کی تقریب تھی۔ یہ دو وقت کا بھوکا یتیم، انہیں دیکھتا ہوا چلا گیا کہ چوک میں کچھ بوجھ اٹھانا مل جائے تو ایک پیسے کے چنے لے سکے۔

———(٥)———

سلیم! تم نے مائی بھولی کو دیکھا ہے؟ وہ اندھی بڑھیا جو پاگل ہو رہی ہے۔ لیکن تم نے اُس کے بیٹے کو شاید نہیں دیکھا۔ اٹھارہ سال کا نوجوان بیٹا۔ اس کا باپ مدت ہوئی چالی پر سے گر کر مر گیا تھا۔ عمارت بنوانے والے نے دوسرے دن اور مزدور کام پر لگا لیا اور کسی کو خبر تک نہ ہوئی کہ کس کا سہاگ لٹ گیا اور کون یتیم ہو گیا۔ اس بچہ کو مائی بھولی نے بڑی مشقت سے چرخہ کات کات کر پالا تھا جس سال بڑے زور کا انفلوئنزا پھیلا تھا، وہ لڑکا بھی بیمار ہو گیا۔ محلہ میں ایک حکیم جی تھے۔ وہ غریبوں کو نسخہ مفت لکھ دیا کرتے تھے۔ بھولی وہاں سے نسخہ تو لکھوا لائی لیکن اتنی کے پیسے پاس نہ تھے کہ دوائی خرید سکے۔ سلیم! باور کرو کہ اس نے محلے کے ایک ایک گھر میں جا کر منتیں کیں کہ کہیں سے کچھ پیسے قرض مل جائیں۔ لیکن کسی نے کچھ نہ دیا۔ نسخہ ہاتھ میں تھا اور سامنے جوان بیٹا جان توڑ رہا تھا۔ بچارا تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ یہ اس دن کا واقعہ ہے جس دن حاجیوں کی اسپیشل ٹرین روانہ ہوئی تھی اور سینکڑوں روپوں کے پھول اسٹیشن پر بکھرے پڑے تھے۔

(۔)

اور تم نے رضیہ بچاری کا پیغام تو اگلے دنوں خود اپنے کانوں سے سُن لیا تھا۔ ذرا اندازہ لگاؤ کہ آج جوان بھائی کے مرنے کی اطلاع ملتی ہے لیکن اس کے پاس اتنے کپڑے نہیں کہ تن ڈھانپ کر گھر کی چار دیواری سے باہر نکل سکے۔ جب اس نے کپڑے بھی مستعار مانگے تھے تو ظاہر ہے کہ بچاری کے پاس زادِ راہ کیا ہوگا۔ اس نے گاؤں کے چوکیدار کو کہلا بھیجا کہ وہ اس کے ساتھ جائے لیکن جب اسے معلوم تھا کہ رضیہ کے پاس کچھ نہیں تو وہ بلا اجرت کیسے ساتھ چلا جاتا؟ گاؤں میں دور نزدیک کے رشتہ دار بھی تھے لیکن کسے فرصت تھی کہ اس کی مصیبت میں اس کے ساتھ ہوتے؟ سارا گاؤں فتو خاں نمبردار کے لڑکے کی شادی کی تیاری میں مصروف تھا۔ غریب اکیلی، چلچلاتی دھوپ میں پیدل روانہ ہو گئی کہ مرنے والے کا منہ تو دیکھ لے۔ (یہ وہی رضیہ تھی جس نے بچپن میں اپنے مرحوم باپ کی معیت میں (جو "شمس العلماء" تھے) دو حج کئے تھے) اور یہ اس گاؤں کا واقعہ ہے جس کے مسلمان مذہبی معاملات میں اپنے کٹرپن میں مشہور ہیں۔ لیکن وہ "مذہبی معاملات" کیا ہیں؟ ذرا سُن لو۔ مقلد اور غیر مقلد کے جھگڑے تو وہاں شروع سے چلے آ رہے تھے۔ اس دفعہ جو میں وہاں گیا ہوں تو ایک اور جھگڑا سننے میں آیا۔ خود مقلدوں کے ہاں بھی دو پارٹیاں بن رہی تھیں اور آپس میں سر پھٹول تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک "عظیم الشان" مسئلہ کے اختلاف کی وجہ سے یہ تنازعہ پیدا ہوا ہے۔ کہیں سے ایک مولوی صاحب تشریف لائے۔ یہ مولوی صاحب بقول ایک گروہ کے بہت "بھاری" مولوی تھے۔ تین تین کوس تک ان کی آواز جاتی تھی۔ انہوں نے مسئلہ بیان کیا کہ مسجد کی شان رسول اللہؐ کی شان سے بڑی ہے۔ کیونکہ رسول اللہؐ خود مسجد میں چل کر آتے تھے اور مسجد کبھی ان کے پاس چل کر نہیں جاتی تھی۔ گاؤں کے مولوی صاحب کو اس سے اختلاف تھا۔ وہ رسول اللہؐ کی شان کو مسجد کی شان سے بڑا سمجھتے تھے۔ پھر کیا تھا دو پارٹیاں بن گئیں۔ باہمی جھگڑے ہوئے، لڑائیاں

ہوئیں، مقدمہ بازی تک نوبت پہنچی۔ قریب سال بھر ہو گیا ہے آگ آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی ہے اور ہر فریق اس مساعئ حسنہ کو "جہادِ عظیم" قرار دے رہا ہے۔ اسی باہمی تشتت و انتشار کا نتیجہ ہے کہ کھیت ویران ہو رہے ہیں فصلیں تباہ ہو چکی ہیں۔ زمین کا بیشتر حصہ سکھوں کے قبضہ میں چلا گیا ہے۔ بقایا رہن رکھا ہوا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد تم دیکھو گے کہ سکھ تمام گاؤں کے مالک بن جائیں گے۔ اور یہ "دین دار" مسلمان ان کے مزارعہ ہو جائیں گے۔ اس پر مولوی صاحب انہیں مبارکباد دیں گے کہ انہوں نے یہاں کی زمین بیچ کر بہشت میں مکان خرید لیا۔ اس لئے یہ سودا خسارے کا نہیں۔

تم کہو گے کہ یہ تو جہلا کی باتیں ہیں۔ لیکن تمہیں وہ خطبۂ جمعہ بھی تو یاد ہو گا جو شہر کی جامع مسجد میں شعبان المعظم کے مبارک مہینے کی تقریب پر تم نے خود سنا تھا۔ جنابِ خطیب نے، جو خدا کے فضل سے دیوبند کے فارغ التحصیل مولوی صاحب ہیں اور جن کے پاس اپنے بیان کی تائید میں سینکڑوں حوالے بھی موجود تھے، یہی فرمایا تھا کہ "شبِ بارات" ایک ایسی رات ہے جس میں اللہ تعالیٰ پکار پکار کر کہتا ہے کہ میرے بندے مجھ سے جو جی میں آئے مانگیں۔ میں ہر ایک کی طلب کو پورا کروں گا۔ لہٰذا جس شخص نے اس رات میں پچاس نفل پڑھ کر مغفرت کی دعا مانگ لی اس کی نجات کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ دار ہے۔" اس کے بعد تمہیں یاد ہو گا کہ مولوی صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے اور انہوں نے فرمایا تھا کہ رحمتِ خداوندی کے اس بحرِ ذخار میں ہر ایک کا حصہ برابر ہو گا۔ لیکن ایک سوختہ بخت اس سے محروم رہ جائے گا۔ لوگوں کی آنکھیں اوپر کو اٹھیں کہ معلوم کریں کہ وہ کون بدنصیب ہو گا جو ابرِ رحمت کی ایسی گہر باری سے فیض یاب نہ ہو سکے گا۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ ہاں ایک، اور صرف ایک شخص اس رحمت سے محروم رہ جائے گا۔ یعنی وہ جس کا پاجامہ اس کے ٹخنوں سے نیچے ہو گا۔ یہ تو تسلیم! "جہلا" کی باتیں نہ تھیں اور نہ ہی مولوی صاحب کچھ اپنی طرف سے بیان کر رہے تھے۔ انہیں یہ سب کچھ "عین اسلام" کہہ کر پڑھایا گیا تھا۔ اور وہ اسی کو "عین اسلام" سمجھ کر آگے پہنچا رہے تھے! ہاں! تو میں تمہیں رضیہ بی بی کی بپتا کی داستان سنا رہا تھا۔ اور ایک رضیہ ہی پر کیا موقوف ہے ذرا اپنے گرد و پیش نظر دوڑاؤ اور دیکھو کہ اس قسم کے کتنے واقعات ہر روز تمہارے سامنے سے گذر جاتے ہیں۔ سو عزیزم! جس سوسائٹی کا نظام یہ ہو اس کے متعلق یہ سوال اٹھانا کہ ان کی نمازیں اور ان کے روزے، ان کی زکوٰۃ، اور ان کے حج، یعنی ان کے "اعمالِ حسنہ" وہ نتائج کیوں نہیں پیدا کرتے جو ہونے چاہئیں تھے۔ کچھ تعجب انگیز نہیں۔ تسلیم! میں پھر کہتا ہوں اور تم اسے غور سے سمجھنے کی کوشش کرو کہ اسلام ایک نظامِ زندگی ہے۔ دنیا کے مذاہب جن میں انسانی تفرقات ہو چکے ہیں، مذہب کو محض انفرادی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ لیکن اسلام ایک ایسا معاشرہ (سوسائٹی) قائم کرنا چاہتا ہے جو نوعِ انسان کی ربوبیت (پرورش) کا ذمہ دار ہے۔ اس مقصدِ عظیم کے لئے اسلام ہر عبدِ مومن کو اس کارگہِ حیات کی عظیم الشان مشینری کا اہم اور کارآمد پرزہ قرار دیتا ہے جس کی ہر حرکت اور جنبش کا اثر تمام مشینری پر پڑتا ہے۔ اگر ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ صالح (محکم اور درست) ہے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ مشینری بھی ایک ضبط و ربط کے ماتحت چلے اور اس کا جیتا جاگتا نتیجہ گھڑی کے ڈائل

کی طرح سامنے آجائے۔ لیکن اگر یہ پرزے الگ الگ پڑے رہیں تو خواہ ان میں سے ہر ایک پرزہ الماس و یاقوت کا کیوں نہ ہو، مشینری بے کار ہو جائے گی، آج ہماری مشینری بیکار ہو رہی ہے اور یہ نتیجہ ہے اس عمل رہبانیت کا جو مسلمانوں کے عقائد و اعمال میں سرایت کر چکی ہے۔ سلیم! غور سے قرآنِ کریم کا مطالعہ کرو تو تم پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ کسی قوم پر ذلّت و مسکنت اور افلاس و نکبت کا چھا جانا اور پھر اس قوم کا اس حالت پر مطمئن ہو جانا، خدا کا غضب ہے، اللہ کا عذاب ہے۔ اور یہ تو تم سمجھتے ہی ہو کہ ایک مغضوب علیہ قوم محض بے روح نمازوں اور رسمی روزوں کے بل بوتے پر اپنے آپ کو منعم علیہ قرار نہیں دے سکتی۔ جب اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ایمان اور عملِ صالح سے استخلاف فی الارض کی زندگی عطا کرے گا تو ظاہر ہے کہ جس ایمان و عمل کا نتیجہ شوکت و عظمت، تمکن و استخلاف نہیں (یا وہ اس حالت کی طرف رفتہ رفتہ نہیں .... جا رہے) وہ ایمان، ایمان اور وہ عمل، عمل صالح نہیں ہو سکتا۔ اس کے سوا تم کسی اور نتیجے پر پہنچ ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ اللہ کے وعدے تو بہرحال سچے ہیں۔ اور اس کا قانون اٹل۔ سلیم! ذرا انسانیت کے معراجِ کبریٰ، یعنی دورِ رسالت کی تاریخ پر نگاہ ڈالو۔ وہ کونسا خاص پروگرام تھا جسے کانفرنسوں اور انجمنوں نے مرتب کر کے قوم کے سامنے رکھا تھا؟ یہی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ہی تو تھا جس نے چند سال کے عرصے میں نہ صرف اس قوم کی تمدنی، اخلاقی اور معاشرتی حالت ہی میں انقلاب پیدا کر دیا، بلکہ ان کی معاشی اور اقتصادی زندگی کی بھی کایا پلٹ دی اور کھجوروں کی گٹھلیوں کے ستو کھا کر گزارہ کرنے والی قوم، قیصر و کسریٰ کی وارث بن گئی۔ ان ہی سیدھے سادے اعمال نے ان کے اندر وہ انقلاب پیدا کر دیا جو ایک مردِ مومن کی نگاہ میں تقدیریں بدل دینے والی قوت پیدا کر دیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ تمام اعمال درحقیقت مختلف اجزا تھے اس پروگرام کے جس کا عنوان (یعنی مقصودِ آخر) قرآن کے پہلے چار الفاظ پر مشتمل ہے۔ یعنی اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ وجہ ستائش اللہ کا وہ پروگرام (نظام) ہے جو دنیا میں خدا کی ربوبیتِ عامہ (نوعِ انسان کی پرورش و تربیت) کا مظہر ہے۔ لہٰذا جو اعمال اس نظام کے قیام کا ذریعہ نہیں بنتے وہ بے روح رسموں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتے۔

(٥)

سلیم! ایک مرتبہ اس حقیقت کو پھر سمجھ لو کہ میرا مقصد یہ نہیں کہ اعمالِ اسلامی کا ماحصل محض اسی دنیا کی فلاح و کامیابی غلبہ و تسلط ہے۔ ہرگز نہیں۔ اگر ایسا ہو تو پھر خدا کی بادشاہت اور فرعون کی حکومت میں فرق کیا ہوا؟ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اعمال اسلامی کا لازمی اور فطری نتیجہ اس دنیا میں حکومت و سطوت اور شوکت و عظمت کی زندگی بھی ہے اور اس کے بعد کی دنیا میں سرخروئی اور آبرومندی کی زندگی بھی۔ اگر ہمارے اعمال اس دنیا میں شوکت و عظمت پیدا نہیں کرتے تو ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارے اعمال اسلام کی میزان میں پورے نہیں اترتے۔

(٥)

سلیم! تم پوچھتے ہو کہ بالآخر یہ عذاب کی زندگی ہم پر مسلّط کیوں ہو گئی؟ حیران ہوں کہ تم اب تک اتنی سی بات بھی نہ سمجھ سکے۔ اس سے تم متفق ہو گے کہ قرآن کا مقصد لوگوں کو تمام خود ساختہ سلاسل و اغلال سے آزاد کر کے ان سے صرف

قانونِ خداوندی کی اطاعت کرانا تھا۔ لیکن سلیم! تم ذرا اپنی تاریخ کے اوراق اُلٹ کر دیکھو کہ جس انسانی استبداد کو مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا، کن کن شاہراہوں سے وہی استبداد اُمّت پر مسلّط کیا گیا۔ اور قیامت یہ کہ اس استبداد کا تسلّط بیشتر مذہب کی آڑ ہیں ہوا۔ اور ہر وہ طوق جسے اتار پھینکنے کے لئے قرآن آیا تھا اسے عین اسلامی بنا کر مسلمانوں کے گلے میں ڈال دیا گیا۔ تم سمجھتے ہو کہ خدا کی میزان میں یہ جرم کچھ ایسا کم وزنی تھا کہ یونہی معاف کر دیا جاتا؟ اُمم گزشتہ جن جرائم کی پاداش میں ذلّت و مسکنت کے عذاب میں گرفتار رہی تھیں، کیا وہ اسی قسم کے جرائم نہ تھے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ فطرت کسی کی سوتیلی ماں ہے کہ وہ ایک بچے کے ساتھ ایک قسم اور دوسرے کے ساتھ دوسری قسم کا سلوک کرے گی۔ اس کے قانون اٹل ہیں اور ان کا ہر ایک پر یکساں طور سے اطلاق ہوتا ہے۔ پہلوں نے یہی کچھ کیا تو ان پر عذاب آیا۔ جب مسلمانوں نے بھی وہی کچھ کیا تو اُن پر عذاب کیوں نہ آتا؟ ان پر تو بلکہ اور بھی زیادہ سختی سے عذاب آنا چاہیئے تھا کہ ان کے پاس قانونِ خداوندی کا ضابطہ اپنی اصلی اور مکمل شکل میں راہ نمائی کے لئے موجود تھا، لیکن انہوں نے اسے پسِ پشت ڈال دیا۔ کیا اس کی سزا اس سے کچھ مختلف ہونی چاہیئے تھی؟ انہیں وراثتِ کتاب کے لئے منتخب کیا گیا۔ نوعِ انسان کے لئے بہترین اُمّت قرار دیا گیا۔ لیکن سب ایمان و عمل کے بدلے میں، نہ صرف نام رکھانے کے عوض۔ اس کے باوجود تم پوچھتے ہو کہ اس قوم پر عذاب کیوں مسلّط ہوا؟ سلیم! اخوّت، مساوات، حرّیت، وحدتِ انسانی، جماعتی زندگی، مرکزیت، اطاعت۔ فرد کا ملّت کے لئے سب کچھ کرنا اور ملّت کا افراد کی ربوبیت کا سامان فراہم کرنا۔ یہ تھیں نظامِ حقیقی کی خصوصیات۔ تم دیکھتے ہو کہ مسلمان اس منشاءِ الٰہی کو کب سے بھولے ہوئے ہیں۔ چھوڑ دو ابتدائی دورِ ہمایوں کے مختصر سے زمانے کو اور اس کے بعد قرآنِ کریم کی کسوٹی سے پرکھتے جاؤ اُمّتِ مسلمہ کے ایک ایک عمل کو۔ حقیقت تمہارے سامنے بے نقاب ہو جائے گی۔

لیکن بایں ہمہ، عزیزم! ہمارے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں جس قرآن کی رُو سے ایک مرتبہ وہ نظام قائم ہوا تھا وہی قرآن آج بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ اگر آج بھی مسلمان اس نکتہ کو سمجھ لیں تو پھر دیکھو ان کی نمازیں اور ان کے روزے کس طرح وہی نتائج نہیں پیدا کرتے جن کے دیکھنے کے تم اور ہر دردمند مسلمان متمنّی ہے: وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۹۶) "اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے تو ہم ان پر زمین و آسمان کی برکات کے دروازے کھول دیتے۔ لیکن انہوں نے قوانینِ خداوندی کی صداقت کو جھٹلایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں ان کے اعمال کی وجہ سے پکڑ لیا۔" اس ایمان و تقویٰ کی حقیقت تمہیں قرآنِ کریم سے ملے گی، بشرطیکہ تم آج تمام غیر قرآنی تصوّرات کو ذہن سے نکال کر، سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس لئے کہ ؎

کھویا گیا جو مطالبِ ہفتاد و دو ملت میں!
سمجھے گا نہ تو جب تک بے رنگ نہ ہو ادراک
(اقبالؒ)

والسلام
(نومبر ۱۹۳۹ء)

-(۰)-

حقائق و عبر

ہماری توہم پرستیاں!

قارئین طلوع اسلام میں سے ایک صاحب نے حقائق و عبر کے لئے دو خبریں ارسال فرمائی ہیں جو درج ذیل ہیں:

پہلی خبر۔ بحوالہ مجلہ رضائے مصطفےٰ۔ بابت فروری ۱۹۸۲ء۔ صد ۱۸۔

حضرت مولانا ریحان رضا خان صاحب و حضرت قاری (رفاقت ؟) رسول صاحب خلیفہ مفتی اعظم ہند و دیگر علمائے سنت نے بتایا کہ جب ولی کامل، عاشق رسول، عارف باللہ حضور مفتی اعظم ہند (غالباً مولانا احمد رضا خان بریلوی مرحوم مراد ہیں) کی میت مبارکہ کو غسل شریف دیا جا رہا تھا تو سہواً ان کے اوپر سے چادر ذرا سی ہٹ گئی تو یکایک عارف باللہ کا دست مبارک حرکت میں آیا اور چادر کو پکڑ کر ان کو ڈھک لیا۔ (رسالہ شمس نوری) ایضاً "قومی آواز" بمبئی $\frac{14}{6}$، ۲۷)

دوسری خبر۔ بحوالہ مجلہ الحق اکوڑہ خٹک۔ محرم ۱۴۰۳ھ۔

معرکہ افغانستان میں ایک طالب علم مولوی محمد شریف علاقہ ارگون آپہنچے اور معاون عبدالحمید صاحب انقلاب اسلامی کے زیر کمان ایک دوست کے ہمراہ ارگون کے جہاد میں شریک ہوئے۔ یہ شہید طالب علم بڑی بے جگری اور بہادری سے دشمن کا مقابلہ کرتے رہے مگر بالآخر کلاشنکوف کی گولیاں دل پر لگیں اور شہید ہو گئے۔ لاش گاؤں پہنچی۔ بوڑھا باپ لاش کے سرہانے کھڑا ہوا اور سب گاؤں والے شہید کو دیکھ کر رو رہے تھے کہ اچانک شہید کے شوریدہ باپ نے بیٹے کو مخاطب کیا کہ "اے میرے لخت جگر اگر تم حق کے لئے اچھے عقیدے کے ساتھ شہید ہو چکے ہو اور تم سے خدا راضی ہوا ہے تو اب مرنے کے بعد مجھ سے مصافحہ کر دو گے تو میں اپنا حق بخش دوں گا۔ ورنہ میں اپنا حق نہیں بخشتا"۔ مجاہدین اور سینکڑوں لوگ اردگرد جمع دیکھ رہے تھے کہ باپ کے جملوں کے ختم ہونے کے ساتھ شہید نے اپنا ہاتھ زخمی دل سے اٹھایا اور باپ کے ساتھ مصافحہ کی غرض سے بڑھا کر بلا دیا اور اسے مضبوطی سے تھام لیا پھر ہاتھ چھوڑ کر دوبارہ اپنے دل پر رکھ دیا۔ باپ نے اس کے بعد باآواز بلند اپنا حق بخش دیا۔

مُردوں کی طرف سے اس قسم کا ردِ عمل قرآن کریم کی نصوص صریحہ کے خلاف ہے۔ سورۂ فاطر میں ہے:

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۞ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا

دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ (۳۵/۱۴)

جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو وہ تمہاری پکار کو سُن نہیں سکتے۔ اور اگر بفرضِ محال اسے سُن بھی لیتے تو تمہیں اس کا جواب نہ دے سکتے۔

اس لئے کہ اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ (۶/۳۶) جواب وہی دے سکتا ہے جو سُن سکے۔ فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى (۳۰/۵۲) تو مُردوں کو کبھی نہیں سُنا سکتا۔ وَمَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِى الْقُبُوْرِ (۳۵/۲۲) تو انہیں نہیں سُنا سکتا جو قبروں میں ہیں۔ وَمَا يَسْتَوِى الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ (۳۵/۲۲) مُردہ اور زندہ کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ (۴۶/۵) جنہیں یہ لوگ (لاش یا قبروں کے سرہانے کھڑے ہو کر) پکارتے ہیں، انہیں اس کی خبر تک نہیں ہوتی کہ کون پکار رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔ حتیٰ کہ انہیں خود اپنے متعلق بھی علم نہیں ہوتا کہ کب اٹھائے جائیں گے (۱۶/۲۱-۲۰)۔

(۶)

اخبار جنگ (لاہور) میں مولانا کوثر نیازی صاحب کا ایک مستقل (ہفتہ وار) کالم شائع ہوتا ہے۔ اس کی ۹ دسمبر ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں اس موضوع پر گفتگو ہوئی ہے کہ بزرگانِ کرام کے جسم، مرنے کے بعد، گلتے سڑتے نہیں بلکہ بجنسہٖ محفوظ رہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی سابقہ کالم میں، نیازی صاحب نے یہ بات حضرت شاہ سلطان باہوؒ کے جسدِ مبارک کے سلسلہ میں لکھی تھی۔ اس ضمن میں مزید کہا گیا ہے:-

"جہاں تک حضرت شاہ سلطان باہوؒ کے جسدِ مبارک کے صحیح سالم رہنے کا تعلق ہے آپ نے بہت سی مستند شہادتیں اور واقعات نقل فرمائے ہیں لیکن اس سلسلہ میں سب سے زیادہ تازہ واقعہ میری ہمشیرہ محترمہ سے متعلق ہے جس کا اسمِ گرامی عائشہ خاتون ہے اور میری حقیقی بہن ہونے کے علاوہ اعلیٰ شاہ انعام الرحمٰن قدوسی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہونے کے رشتہ سے میری پیر بہن بھی ہیں۔ محترمہ مذکورہ کی وفات جون ۱۹۵۷ء میں ہوئی اور تدفین ہمارے آبائی قبرستان (گنج سادات جیلانی) چاندپور ضلع بجنور (یوپی ہندوستان) میں ہوئی۔ انتقال سے تقریباً چار سال بعد جولائی ۱۹۶۱ء میں چاندپور میں سیلاب آیا جو اکثر تالابوں کی کثرت اور نشیبی علاقہ ہونے کی وجہ سے آتا رہتا ہے۔ اس سے قبرستان کی اکثر قبور متاثر ہوئیں۔ چنانچہ میری ہمشیرہ بزرگ جن کو شہر بھر میں ان کی شفقتوں کی وجہ سے "آپا جان" کہا جاتا تھا کی قبر بھی متاثر ہوئی۔ میرے حقیقی چچا اور محترمہ مذکورہ کے خسر حضرت حکیم سید شاہ آلِ حسن صاحب اشرف الجیلانی مرحوم حالات کا جائزہ لینے کے لئے جب قبرستان پہنچے اور یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ عائشہ خاتون کی قبر دونیم ہو چکی ہے لیکن پانی قبر کے اندر نہیں بھرا۔ کفن بالکل صاف شفاف سفید جوں کا توں ہے پورا جسم ڈھکا ہوا ہے لیکن ایک پاؤں کا پنجہ کفن سے باہر آگیا ہے۔ پنجہ کے تلوے اور انگلیوں کے ناخن ایسے ہی سُرخ ہیں جیسے تازہ تازہ مہندی لگائی گئی ہو۔ محترم چچا جان نے اپنے مراقبے کا رومال ان کے پاؤں پہ ڈال کر انہیں چھپا دیا اس کے بعد ہمشیرہ صاحبہ کے بڑے صاحبزادے کو حکم دیا کہ وہ کفن سے اپنی والدہ کے پاؤں کو ڈھانپ دے اس کے بعد اس کچی قبر کو پختہ مقبرہ میں تبدیل کر دیا گیا۔"

دوسرا خط عزیز الرحمٰن صاحب کا ہے جنہوں نے اپنے گاؤں بفہ ضلع مانسہرہ کا ایک واقعہ قلم بند کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ضلع مانسہرہ میں بفہ سے چھ میل آگے حاجی آباد کے قبرستان کے پاس آج سے کئی سال پہلے میرے چچا کا کھلیان تھا چچا بیمار ہو گئے اور انہوں نے وہاں پر فصل اگانا چھوڑ دیا چونکہ وہ جگہ قبرستان کے متصل تھی اس لئے گاؤں والوں نے اسے بھی قبرستان کے مقصد کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ہمارے ایک دُور کے رشتہ دار کی قبر بھی وہیں کھودی گئی۔ قبر کھودتے وقت ایک پتھر کا تختہ برآمد ہوا جسے اُٹھانے پر نیچے سے سفید کفن دکھائی دیا۔ جو بوسیدہ ہو چکا تھا لیکن لاش بالکل سلامت تھی۔ لوگوں نے اسے فوراً ڈھانپ کر وہاں پر قبر بنا دی۔ اس واقعہ کے چشم دید گواہ آج بھی ہمارے گاؤں میں موجود ہیں۔"

جامع مسجد صابری کراچی کے خطیب مولوی سردار محمد صاحب نے اس موضوع پر بعض تاریخی حوالے فراہم کئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :-

"ایک صاحب نے آپ سے اس کلمہ پہ اعتراض کیا جو کہ آپ نے حضرت سلطان باہوؒ کی نعش کے بارے میں لکھا۔ لکھتے ہیں کہ "اس کلمہ سے شرک کی بو آتی ہے"! معترض کے اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں تاریخ کے مطالعہ کی فرصت نہیں ملی۔ ورنہ وہ ایسا جملہ کبھی نہ کہتے۔ اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض لوگ اولیاء اللہ کو اپنے اوپر قیاس کر لیتے ہیں اور جس فن کے ماہر نہ ہوں اس میں بھی چہ میگوئیاں شروع کر دیتے ہیں اسی لئے تو کسی نے کہا ہے۔ ؎ لذّت مے نہ شناسی بخدا تا نہ چشی

حضرت فاروق اعظمؓ کے زمانے میں نجران سے ایک آدمی نے ایک غیر آباد زمین میں گڑھا کھودا۔ اس میں عبداللہ ابن تامر شہید کو پایا کہ سر کے زخم پر ہاتھ رکھا تھا۔ جب ہاتھ ہٹایا گیا تو خون بہنے لگا، جب ہاتھ چھوڑا تو زخم پہ رکھ دیا اور خون بند ہو گیا (سیرت ابن ہشام مع روض الانف) اس کی تصدیق شہدائے احد کے واقعہ سے بھی ہوتی ہے۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ طویل زمانہ گزر جانے کے باوجود بھی ان کے بدن متغیر نہیں ہوئے اسی طرح جب امیر معاویہؓ نے چشمہ کھودا تو حضرت امیر حمزہؓ کا وجود صحیح سالم ملا جب ان کی انگلی پر بیلچہ لگا تو خون بہنے لگا اسی طرح عبداللہ ابن حرام کے والد عمر بن جموح اور طلحہؓ ابن عبیداللہ کو چھیس برس کے بعد نکالا گیا تو بدن بالکل سلامت تھے۔ اس واقعہ کو ابن قتیبہ نے معارف میں لکھا ہے۔ اس قسم کے سینکڑوں واقعات مؤرخین نے نقل کئے ہیں۔ کسی کو دیکھنے کا شوق ہو تو میرے شیخ المکرم حضرت مولانا اللہ یار خان مدظلہٗ آف چکڑالہ کی مشہور زمانہ تصانیف "حیات برزخیہ" اور "حیات انبیاءؑ" کا مطالعہ کر لے۔"

ہم ان واقعات کی صحت و سقم سے متعلق بحث نہیں کرنا چاہتے۔ ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ انسانی جسم (خواہ وہ کسی کا بھی ہو) فطرت کے قوانین طبیعی کے تابع ہوتا ہے —— زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی —— حضور نبی اکرمؐ نے (حسب روایات) اپنے مرض الموت میں فرمایا تھا کہ "یہ بخار اس زہر کی وجہ سے ہے جو خیبر کی یہودیہ نے کھانے میں ملا دیا تھا"۔ اس سے (اور اسی قسم کے دیگر واقعات سے) ظاہر ہے کہ 'اور تو اور' حضرات انبیاء کرامؑ کے جسم بھی فطرت کے طبیعی قوانین کے مطابق رد عمل

ہوتے تھے۔ انہی قوانین کے مطابق وہ تندرست رہتے تھے۔ مریض بھی ہوتے تھے اور بالآخر وفات بھی پا جاتے تھے۔ جب زندگی میں ان کے اجسام ان قوانین کے تابع رہتے تھے تو وفات کے بعد اس میں استثناء کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اگر ان میں سے یا بزرگانِ کرام میں سے کسی کا جسم بعد از موت طبعی اسباب سے محفوظ رہتا تھا (یا رہتا ہے) تو اس کے اسباب طبعی تھے۔ اس میں ان کی بزرگی اور تقدس کا دخل نہیں تھا۔ اس سلسلہ میں خود نیازی صاحب کے زیرِ نظر کالم میں شہادت موجود ہے۔ اس میں کہا گیا ہے:۔

"پشاور کے ایک میڈیکل پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف (ایم بی بی ایس، ایم سی پی ایس) نے مسئلہ زیرِ بحث پر جدید طبّی سائنس کی رُو سے روشنی ڈالی ہے۔

"آپ نے مرنے کے بعد حضرت سلطان باہوؒ اور دوسرے اولیائے کرام کے جسموں کے صحیح سالم رہنے پر جو کچھ لکھا ہے وہ ڈاکٹری نقطۂ نگاہ سے بھی ثابت ہے۔ مرنے کے بعد جسم میں جو تبدیلیاں آتی ہیں ان کا انحصار آدمی کے جسمانی ڈیل ڈول، عمر، جنس، بیماری یا صحت، موسم، جراثیم، رہنے والی زمین اور بعض دوسرے عوامل پر ہوتا ہے۔ اگر موسم بہت ٹھنڈا ہو تو جسم کے سڑنے کے لئے بہت سارے گھنٹوں یا دنوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

اگر ہوا میں رطوبت نہ ہو تو جسم تقریباً اصلی حالت میں رہتا ہے جیسا کہ ریگستانی علاقوں میں ممی لاشیں پائی جاتی ہیں۔ اگر جسم میں جراثیم نہ ہوں یا اسے جس زمین میں دفن کیا گیا ہو وہ جراثیم سے پاک ہو تب بھی لاش محفوظ رہتی ہے

اولیائے کرام کے بارے میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ مذہبی لحاظ سے تو صحیح ہے ہی[1] میڈیکل فلسفے کے لحاظ سے بھی اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔ یہ حضرات زیادہ تر روزے سے رہتے ہیں ان کے جسم پر نہ ہونے کے برابر چربی ہوتی ہے۔ قوت مدافعت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ جراثیم سے پاک ہوتے ہیں، پُرسکون دل کی رفتار بہت کم ہوتی ہے اس لئے اگر ان کے مقدس جسم مرنے کے بعد محفوظ رہیں تو اس پر تعجب کیوں؟"

آپ نے غور فرمایا کہ ڈاکٹری نقطۂ خیال سے مُردہ کے جسم کے محفوظ رہنے کے جو اسباب بتائے گئے ہیں وہ خالصۃً طبیعی (PHYSICAL) ہیں۔ ان میں کسی بزرگ اور گنہگار کا جسم تو ایک طرف، مسلم اور غیر مسلم کے جسم میں بھی کوئی فرق نہیں۔ ہر انسان کے جسم پر ان اسباب کا اثر یکساں ہوتا ہے۔ ان اسباب میں کئی ایک اور اسباب کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ امریکہ سے شائع ہونے والے رسالہ ریڈرز ڈائجسٹ کی اکتوبر ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں ایک بڑا دلچسپ مضمون شائع ہوا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے، کہ نپولین بوناپارٹ کی موت طبیعی نہیں تھی۔ اسے (قید کے دوران) بڑی ہلکی مقدار میں سنکھیا دیا جاتا رہا تھا، جس سے بالآخر اس کی موت واقع ہوئی تھی۔ اس انکشاف کے ثبوت میں دیگر شواہد کے علاوہ، ایک شہادت یہ بھی تھی کہ نپولین کی موت کے انیس سال بعد جب اس کا کفن کھولا گیا تو اس کی لاش بالکل صحیح و سالم اور تر و تازہ شکل میں برآمد ہوئی۔ مقالہ میں کہا گیا ہے کہ سنکھیا جہاں ہلاکت انگیز ہے وہاں

---

[1] ڈاکٹر صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ میڈیکل اسباب اور وجوہ کے ساتھ مذہب کا کیا تعلق ہوتا ہے؟

یہ (ہلکی متواتر مقدار میں) جسم کے (TISSUES) کو گلنے سڑنے سے محفوظ بھی رکھتا ہے۔ چنانچہ عجائب گھروں میں اس کا استعمال عام ہوتا ہے۔ مصر کی ممیوں کو محفوظ رکھنے کے لئے جو مصالحہ استعمال کیا گیا ہے اس میں بھی غالباً اہم جزو یہی تھا۔

ہماری اس گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں حضرات انبیاء کرامؑ و بزرگانِ عظامؒ کی عظمت اور تقدیس کے ثبوت میں ان کے اجسام کے طبعی عناصر کو پیش نہیں کرنا چاہیئے۔ ان کی عظمت، ان کی پاکیزگیٔ سیرت اور بلندیٔ کردار کی وجہ سے ہے نہ کہ ان کی کسی جسمانی خصوصیت کی وجہ سے۔ ان کی عظمت کے لئے ان کی کسی جسمانی خصوصیت کو پیش کیا جائے تو غیر مسلم اپنے بزرگوں (ہندو سادھوؤں، سنیاسیوں اور عیسائی SAINTS) کی ان سے بھی بڑھ کر جسمانی خصوصیت پیش کر دیں گے۔ تصوف نے یہی غلطی کی اور "اولیاء اللہ" کی روحانیت کے ثبوت میں طبیعی کرامات پیش کر دیں تو غیر مسلموں نے اپنے بزرگوں کی ایسی "کرامات" پیش کر دیں جن کے سامنے ہمارے بزرگوں کی کرامات ماند پڑ گئیں (تفصیل ان امور کی پرویز صاحب کی کتاب "تصوف کی حقیقت" میں ملے گی)۔ قرآن کریم نے جب حضرات انبیاء کرامؑ کے متعلق "بشر مثلکم" (تمہارے جیسا انسان) کہا تھا تو اس سے ان کی طبیعی زندگی مراد تھی جو دوسرے انسانوں جیسی تھی۔ چنانچہ نبیؐ عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا تھا (۲۵/۷)۔ اس کے بیوی بچے بھی ہوتے تھے (۱۳/۳۸) حتیٰ کہ اس کی موت بھی دیگر انسانوں کی طرح طبیعی اسباب کے تحت ہوتی تھی۔ حضورؐ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے۔ إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ (۳۹/۳۰) "تو نے بھی مرجانا ہے اور انہوں نے بھی۔"

بنا بریں، ہمیں یہ نہیں چاہیئے کہ حضرات انبیاء کرامؑ یا صحابہؓ امت کی کسی طبیعی (جسمانی) خصوصیت کو (اگر وہ ہو بھی تو) ان کی عظمت اور تقدیس کے ثبوت میں پیش کریں۔ (جیسا کہ کیا جاتا ہے) ان کی عظمت، ان کی پاکیزگیٔ سیرت اور بلندیٔ اخلاق کی بنا پر ہے۔ اور اسی کو دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہیئے۔ جسمانی خصوصیات کی بنا پر انہیں فوق البشر ثابت کرنے کا نتیجہ توہم پرستی ہوگا۔ اس کے برعکس ان کی سیرت و کردار کے تذکروں سے لوگوں میں اپنی سیرت کو پاکیزہ بنانے کا جذبہ بیدار ہوگا۔ ہم توہم پرستی کے ہاتھوں کافی پٹ چکے ہیں۔ اسے جاری رکھنا اور تقویت دینا ہمیں بدستور دین سے دور اور عالم کردار سے بیگانہ رکھے گا۔

۴۔ کوڑوں کی سزا انگریزوں کا ورثہ ہے

انگلینڈ کے مشہور اخبار (THE GUARDIAN) نے اپنی ۱۵ دسمبر ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کے دورۂ امریکہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صدر محترم نے کیلیفورنیا میں اپنی پبلک تقریر کے دوران کہا:

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ ہماری عسکری حکومت نے بعض لوگوں کو کوڑے مارے ہیں۔

لیکن آپ لوگوں کو پاکستان کے حالات کو پاکستانیوں کی نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔ ہم بھی تمہاری طرح انسانی آزادی کا شعور رکھتے ہیں۔ ہم اپنے ریکارڈ پہ ایسا ہی فخر کرتے ہیں۔ جیسا شاید تم اپنے ریکارڈ پر فخر کرتے ہو۔ ہم نے بے شک بعض لوگوں کو کوڑے مارے ہیں لیکن کوڑوں کی سزا ہمیں انگریزوں سے ورثہ میں ملی ہے۔ صدر ضیاء الحق نے یہ بھی کہا کہ اگر ایک نشوونما پانے والی اور اسلامی مملکت کے پس منظر میں دیکھا جائے تو انسانی حقوق کے سلسلہ میں ہمارا ریکارڈ (بہت) اچھا ہے۔

۳۔ قوت کا علاج!

فلسطینی صاحب یافت کر گئے ہیں کہ مملکت اسرائیل نے جو کچھ غصب کر رکھا ہے ساری دنیا کی مہذب قومیں (بجز اس کے حمایتیوں کے) اس کی مذمت کرتی ہیں اور اسے واپس دے دینے کی اپیلیں بھی۔ لیکن اس پر ان اپیلوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟

اس کی بنیادی وجہ تاریخ کی (اور ہماری روزمرہ کی زندگی کی) یہ شہادت ہے کہ جس شخص یا جس قوم نے جو چیز قوت کے ذریعے حاصل کی ہو، وہ اسے دلیلوں اور اپیلوں کی رُو سے کبھی نہیں چھوڑتی۔ ان کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اقبالؒ نے بہت پہلے کہا تھا کہ ؎

ترا ناداں امیدِ غم گساری ہا ز افرنگ است
دلِ شاہیں نہ سوزد بہر آں مرغے کہ در چنگ است

عقاب جس پرندے کو اپنے پنجوں میں دبوچ لیتا ہے اس کی چیخ و پکار سے اس کا دل کبھی نہیں پسیجتا۔

قوت کا آخری علاج قوت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ رسولوں کو بھیجا جاتا تھا کہ وہ دلائل و براہین کی رُو سے (بالبیّنٰت) لوگوں کو صحیح راستے پر چلنے کی دعوت دیں۔ جو لوگ اس طرح راہِ راست پر آنے کے لئے آمادہ ہو جائیں، ان میں قوانین کی رُو سے نظامِ عدل قائم کریں (وانزلنا معھم الکتاب والمیزان) لیکن جو قوت کے نشہ میں بدمست، صحیح بات کے سننے تک کے لئے تیار نہ ہوں، اور جو کچھ انہوں نے قوت کے بل بوتے پر غصب کر رکھا ہو اسے چھوڑ دینے کے لئے آمادہ نہ ہوں، تو انہیں قوت کے ذریعے اس غصب و نہب سے باز رکھا جائے۔ (وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ $\frac{۵۷}{۲۵}$)

لہٰذا اس قسم کے اشخاص اور اقوام کا آخری علاج قوت کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔

۴۔ وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

مغربی سوداگروں کی عام روش ہے کہ وہ ایک چیز کو ایجاد کرتے ہیں۔ پھر اپنے مخصوص پروپیگنڈہ[1]

[1] (حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمایئے)

کے ذریعے اسے دُنیا کے ہر ملک، ہر شہر، ہر قریہ، ہر محلہ، ہر گھر بلکہ ہر متنفس تک پہنچا کر انہیں اس کا خوگر بنا دیتے ہیں اس کے بعد اپنی کسی مصلحت کے تحت مشہور کر دیتے ہیں کہ اس کا استعمال کس قدر مضرت رساں ہے۔ (مثلاً) سگرٹ کو لیجئے۔ اسے انہوں نے ایجاد کیا اور اس قدر عام کیا کہ اب ہمارے ہاں کا قریب قریب ہر متنفس یا سگرٹ نوش ہے یا اس کا دودکش۔ اسے اس قدر عام کرنے کے بعد یہ پروپیگنڈہ شروع ہوا کہ سگرٹ زہر ہے۔ یکسر زہر۔ اس سے چھوٹی موٹی بیماریاں تو ایک طرف، سرطان (کینسر) تک ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس کے خلاف پروپیگنڈہ شروع ہوا تو سگرٹ کی ہر ڈبیا پہ لکھ دیا کہ یہ مضرت رساں ہے۔ (POISON) ہے۔ یہ لکھا گیا اور سگرٹ دھڑا دھڑ بکتے اور بکتے چلے گئے۔ ٹی۔وی پر اس کی مضرت رسانی کا عنوان تھا —— خودکشی کا آسان طریقہ —— لیکن یہ اعلان دو منٹ کا ہوتا۔۔ تو سگرٹ کے حق میں ہر پانچ سات منٹ کے بعد نہایت دل کش اور جاذب نگاہ اشتہارات سامنے آتے۔۔ اور آتے ہیں۔

سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سگرٹ اس قدر مہلک ہیں، اور حکومت کو اس کا اعتراف ہے کہ یہ خودکشی کے مرادف ہیں، تو حکومت ان کا بننا اور بکنا حکماً بند کیوں نہیں کر دیتی؟ اس راز کو روزنامہ جنگ (لاہور) کی ۶ جنوری ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں شائع ہونے والی حسب ذیل خبر نے افشا کر دیا ہے:

اسلام آباد۔ ۵ جنوری (نمائندہ جنگ) اعلیٰ سرکاری ذرائع سے حاصل ہونے والے اعداد و شمار کے مطابق گذشتہ سال کے دوران پاکستان میں لوگوں نے ۲۷ ارب ۶۶ کروڑ ۵ لاکھ سگرٹ پئے جن کی مجموعی مالیت ۵ ارب ۶۵ کروڑ ۹۲ لاکھ روپے بنتی ہے۔ سگرٹ پینے والوں میں زیادہ تعداد دانش وروں اور دوسرے دماغی کام کرنے والوں کی ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق گذشتہ سال کے دوران صرف سگرٹ پر سے حکومت کو تین ارب ۶۹ کروڑ ۴۴ لاکھ روپے کی ڈیوٹی حاصل ہوئی۔ سگرٹ پر اس وقت قابل وصول قیمت کا ۵۲ فی صد اور ۷۲ فی صد ڈیوٹی ہے۔ اس طرح سگرٹ کے پیکٹ سے جس کی قیمت دس روپے بنتی ہے۔ ۷ روپے ۷۷ پیسے حکومت کو ڈیوٹی ملتی ہے۔

یعنی حکومت اپنی تین چار ارب روپے کی آمدنی کی خاطر قوم کو ہلاک کر رہی ہے! باقی رہا ڈبیوں پہ زہر لکھنا، تو وہ محض بغرض "حصولِ ثواب" ہے۔

۵۔ گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے۔

غالب نے کہا تھا کہ۔ قدرِ شعرِ من بگیتی بعد من خواہد شدن۔ (میرے اشعار کی قدر میری زندگی کے بعد ہوگی)۔ جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے۔ اور نئے نئے حقائق سامنے آتے جاتے ہیں، اس کے اشعار کی قدر بڑھتی جاتی ہے۔ جس

۱؎ (حاشیہ سابقہ صفحہ) یہ پامال سا پورا شعر یوں ہے ؎

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بوقتِ عیدِ قرباں　　وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

شعر کا مصرعہ اولے زیب عنوان ہے، وہ پورا شعر یوں ہے۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

روزنامہ جنگ (لاہور) کی ۱۱ جنوری سنہ کی اشاعت میں ایک صاحب کا مراسلہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "رزقِ حلال اور تنخواہیں" اس میں انہوں نے کم درجہ ملازمین حکومت کی معاشی بدحالی کا ذکر کرتے ہوئے (آخر میں) کہا ہے کہ:

> ملک میں سرکاری ملازمین ہیں جو حکومت کی نظر میں معزز شہری شمار ہوتے ہیں اور حکومت کو ٹیکس وغیرہ ادا کرتے ہیں، ان سے جیل کے قیدیوں سے بھی بدتر سلوک ہوتا ہے۔ حقائق کے مطابق جیل میں ماخوذ ملزمان کی خوراک کے واسطے روزانہ ساڑھے پانچ روپے خرچ کیا جاتا ہے۔ جبکہ اوسط تعداد پانچ افراد کے ایک گھرانے کے کفیل جونیئر کلرک کو صرف (۵۰۰) روپے ماہانہ تنخواہ دی جاتی ہے۔ اہلِ دانش اور اربابِ حل و عقد کو اس صورتِ حال کی طرف توجہ دینی چاہیے تاکہ تنخواہ میں سرکاری ملازم کے گھر کے افراد کو قیدیوں کے معیار کے مطابق تو خوراک کا خرچ ملنا چاہیے۔

مراسلہ نگار نے صرف خرچ خوراک کا موازنہ کیا ہے۔ اس کلرک کو کرایہ مکان، بجلی، پانی، گیس کے بل کم از کم مہترانی کی تنخواہ۔ کپڑے لتے کا خرچ بھی اسی تنخواہ سے کرنا پڑتا ہے۔ جیل کے قیدی کو یہ مراعات مفت حاصل ہوتی ہیں۔ اخراجات کے علاوہ قیدی ان پریشانیوں سے بھی آزاد ہوتا ہے جو اس مردِ آزاد کو آٹا، دال، گوشت، سبزی اور چینی کے حصول کے لئے اٹھانی پڑتی ہیں۔ اور قیدی کی سب سے بڑی بے فکری حفاظت کی طرف سے ہے! اس کی حفاظت کے لئے سینکڑوں پاسبان متعین ہوتے ہیں اور آزاد شہری دن رات لُٹتے رہتے ہیں۔ دیکھا آپ نے کہ گوشے میں قفس کے کس قدر آرام ہے!

سلسلۂ مطالب الفرقان

مطالب الفرقان، علومِ حاضرہ کی روشنی میں قرآن مجید کی تفسیر خود قرآن کی رُو سے کی گئی ہے۔ اس سے قرآن فہمی کی دنیا میں ایک انقلاب واقعہ ہوا ہے اور اس کے قارئین کا کہنا ہے کہ اس سے پہلی بار قرآن کی عظمت اور اس کے حقائق کی بلندی نکھر کر سامنے آئی ہے۔ اس سلسلہ کی پانچ جلدیں شائع ہو چکی ہیں لیکن جلد دوم کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا تھا جس سے اس سلسلہ کا تسلسل قائم نہیں رہا تھا۔ بحمد اللہ اب

مطالب الفرقان جلد دوم

سابقہ آب و تاب کے ساتھ دوبارہ چھپ گئی ہے اور پانچوں جلدوں کا مکمل سیٹ دستیاب ہو سکتا ہے۔ اس جلد کی قیمت -/۵۰ ڈاک خرچ -/۲ روپے۔ (ناظم ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی گلبرگ ۲ - لاہور)

قرآن اعظیم

پرویز صاحب کی زندگی کا مشن قرآنی فکر و تعلیم کی نشر و اشاعت ہے۔ اس کے متنوع ذرائع میں سے ایک اہم اور مؤثر ترین ذریعہ ان کا ہفتہ واری درس قرآن مجید ہے۔ پہلے تو یہ صرف مقامی تھا لیکن ٹیپ ریکارڈنگ اور وی۔ سی۔ آر کی ایجاد کے بعد، یہ پاکستان اور بیرونی ممالک تک میں پھیل گیا ہے اور نہایت خوش گوار نتائج مرتب کر رہا ہے۔ انہوں نے یہ سلسلہ سنہ ۱۹۵۳ء میں شروع کیا تھا لیکن وہ متفرق عنوانات پر مشتمل تھا۔ سنہ ۱۹۵۵ء سے انہوں نے مسلسل درس قرآن کی ابتدا کی جس کا پہلا دور دسمبر سنہ ۱۹۶۶ء میں تکمیل تک پہنچا اور مارچ سنہ ۱۹۶۷ء سے دورۂ ثانی کا آغاز ہوا۔ ان ہر دو تقاریب پہ انہوں نے خصوصی درس دیئے جن میں قرآن کریم کے ساتھ اپنی والہانہ وابستگی اور قرآن فہمی کے طریقوں پہ نہایت مفید گفتگو کی۔ ان کے یہ درس قرآنی تعلیم کے سلسلہ میں مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کی عام افادیت کے لئے ان کا اعادہ کیا جاتا ہے۔

درسِ اوّل ——— تکمیلی دورہ قرآن مجید (سنہ ۱۹۶۶ء)

عزیزانِ گرامی قدر! سلام و رحمت!

یوں تو انسانی زندگی، سلسلۂ روز و شب ہی سے عبارت ہے، لیکن اس سلسلہ میں بعض کڑیاں ایسی بھی آجاتی ہیں جنہیں بجا طور پہ سرمایۂ حیات اور حاصلِ زندگی قرار دیا جا سکتا ہے۔ میری زندگی میں آج کا دن اس سلسلہ کی ایک ایسی ہی کڑی ہے۔ اس دن کی یاد بقایائے زندگی میں، میرے لئے وجہ بالیدگیٔ روح اور باعث شادابیٔ قلب ہوگی۔

(۲) میں قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب العلم ہوں، اور یہی میری متاعِ حیات اور مایۂ افتخار ہے۔ میری زندگی کا ابتدائی دور قدامت پرستی کی تنگ ناؤں میں گزرا۔ کبھی مسجد کے حجروں میں، قال، اقول کی بحث و جدل میں اور کبھی خانقاہوں کے خلوت کدوں میں منازلِ تصوف کی رہ نوردی میں۔ یہ وہ دور تھا جس میں چشم بند و گوش بند و لب بہ بند، معراجِ علم۔ اور بے شبادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید — اوجِ روحانیت سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد جب

میرے شعور کی آنکھ پیدار ہوئی تو فکر و تدبّر کی تابندہ شعاعوں نے جمُود کی اُن برفانی سِلوں کو آہستہ آہستہ پگھلانا شروع کیا جو کورانہ تقلید اور اندھی عقیدت کے یخ خانہ (کولڈ سٹوریج) کی فطری پیداوار تھیں ـــ یعنی، عقل و فکر کے چراغ گُل کر دینے والی ماضی پرستی کے تیرہ و تاریک غاروں سے نکل کر تیشۂ فہم و فراست سے اپنی راہیں آپ تراشنے کی دعوت دینے والی تابناک وادیوں میں کس طرح پہنچا، یہ ایک طویل داستان ہے جسے بیان کرنے کا یہ موقعہ نہیں۔ بہرحال، ان وادیوں میں پہنچ کر، جب جمُود و تعطّل کی برفانی سِلیں پگھلنی شروع ہوئیں تو ان کے نیچے دبی ہوئی شکوک و شبہات کی پھانسیں یوں اُبھرنے لگیں جس طرح عرقِ لیموں سے لکھے ہوئے حروف، کاغذ کو آگ کے سامنے لانے سے ایک ایک کر کے نمودار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ دَور میری زندگی کا تلخ ترین زمانہ تھا۔ اک طرف وہ جنت مجھ سے چھین چکی تھی جو فسونِ خودفریبی کی تخلیق تھی اور فردوسِ یقین آفریدہ کی طرف جانے والا راستہ نگاہوں کے سامنے نہیں آ رہا تھا۔ ریب و تشکیک کے سانپ متواتر ڈستے چلے جاتے تھے اور اُن کے زہر کا تریاق کہیں سے میسّر نہیں آ رہا تھا۔ میرے سابقہ ایمان کا ایک ایک گوشہ، اعتراضات کے طوفانوں کی نذر ہوتا جا رہا تھا ـــ اور دلیل و برہان کی کوئی دیوار ایسی نہ تھی جو ان کی یورشوں کو روک سکے۔ دشتِ تحیّر کی ان وادیوں میں یہ سلسلہ مارا مارا پھرتا رہا۔ عدمِ یقین کے نشتروں سے میرا قلب، برنگِ غنچہ لبریز جراحت اور فقدانِ ایمان کی برق سامانیوں سے میرا سینہ پروردۂ آغوشِ محشر بنا رہا۔ یہ ویسا ہی دَور تھا جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومیؒ، کبھی پیچ و تابِ رازیؒ

شکوک و شبہات کی تلاطم خیزیوں میں صرف ایک روشنی کا مینار تھا جس نے میری کشتیٔ امید کو نذرِ طوفان ہونے سے بچا لیا۔ یہ مینار، یہ لنگر، یہ ساحل تھا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ پہ میرا یقینِ محکم۔ جب اعتراضات کی اضطراب انگیز موجیں، خدا، وحی، آخرت پر ایمان کو متزلزل کرنے کے لئے اُٹھتیں تو یہ خیال ان کے راستے میں حائل ہو جاتا کہ جس ذاتؐ کی سیرت ایسی بلند ہو وہ نہ تو خود فریبی کا شکار ہو سکتی ہے، نہ فریب دہی کی مرتکب۔ اس لئے اُسؐ نے جن حقائق کے مبنی بر صداقت ہونے کی شہادت دی ہے انہیں پرکھے بغیر جھٹک نہیں دینا چاہیئے۔ یہ تھا، عزیزانِ محترم سیرتِ محمدیہ پہ میرا ایمان، جس نے میری زندگی کے دھارے کا رُخ موڑ دیا۔ اور میں نے سابقہ توہمات سے خالی الذہن ہو کر قرآن کریم کو علم و بصیرت کی روشنی میں از خود سمجھنے کی کوشش شروع کی۔ اس ہمت طلب سفرِ زندگی، اور صبر آزما مراحلِ حیات میں مجھے کس کس سنگلاخ زمینوں سے گزرنا پڑا، اور ان میں مجھے کہاں کہاں سے راہ نمائی ملی، کیسی کیسی کوہکنی اور خارہ شگافی سے میرا واسطہ پڑا، اور میں نے کس جگر سوزی اور تفس گدازی سے راستے کے ان موانعات کو دُور کیا، یہ داستان بھی طویل ہے اور فرصت طلب۔ اس وقت میں صرف اتنا عرض کر دینے پر اکتفا کروں گا کہ میں قریب تیس[1] سال سے مسلسل قرآن کریم پر غور و فکر کرتا چلا آ رہا ہوں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں آج، بہ کمالِ عجز و نیاز لیکن بہ تمامِ تحتم و یقین، اس

[1] اب پچاس سال۔

حقیقت کے اعلان کرنے کے قابل ہوں کہ خدا کی اس کتابِ جلیل کے ایک ایک لفظ کی صداقت پر میرا محکم یقین ہے۔ اور یہ ایمان علم و بصیرت پر مبنی اور دلائل و براہین پر استوار ہے۔ اس نعمتِ کبریٰ کے حصول پر جہاں میرا سرِ نیاز بحضورِ ربّ العزّت سجدہ ریز ہے، وہاں میری جبینِ شوق، اُس ذاتِ اقدس، اُس چراغِ آفرینش، اُس شاہدِ دین و جانِ ایمان کی بارگاہِ عزّت مآب میں سراپا سپاس ہے جس کے حسنِ سیرت کی جلوہ باریوں نے میری نگاہوں کو وہ نورِ بصیرت عطا کر دیا جس سے میں، قرآنی حقائق پر یقینِ محکم سے" از سرِ نو مسلمان" ہونے کے قابل ہو گیا۔ اور صرف مسلمان ہونے کے قابل ہی نہیں بلکہ شہدائے زندہ کے متعلق، جو ہر دیدۂ بینا کے لئے بہارِ گلفشاں اور ہر گوشِ نصیحت نیوش کے لئے عید شنیدن ہے۔ اقبالؒ کی ہم نوائی میں یہ کہنے کے قابل بھی کہ ؎

فاش گویم آں چہ در دل مضمر است　　　ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود　　　جاں چوں دیگر شُد، جہاں دیگر شود

جب اس کتابِ عظیم کے حقائق، ذہن کو منوّر کرتے ہیں تو اُس کا ایک ایک ذرہ جوشِ انا الشرق سے روکشِ صد آفتاب ہو جاتا ہے۔ اور جب اس کے بصائر خلوت گاہِ قلب کو وسعت آشنا کرتے ہیں تو خونِ رگِ حیات کا ایک ایک قطرہ دعوائے انا البحر سے آفاق گیر و کائنات در آغوش ہو جاتا ہے۔ قرآن، عزیزانِ من! مذہبی دنیا کی جنتر منتر کی کتاب یا خالی پند و نصائح کا مجموعہ نہیں۔ یہ وہ ضابطۂ قوانین ہے جس کے مطابق یہ سارا کارگہِ کائنات اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے۔ یہ وہ میزانِ عدل ہے جس میں افراد اور اقوام کے ایمان تلتے، اور ان کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ جو قوم اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتی ہے، اسے اس دنیا میں بھی سرفرازیاں اور سربلندیاں نصیب ہوتی ہیں اور وہ مستقبل (آخرت) کی خوشگواریوں اور شادکامیوں سے بھی نوازی جاتی ہے۔ جو اس راہ کو چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کرتی ہے، وہ یہاں بھی ذلیل و خوار ہوتی ہے، اور آخرت میں بھی روسیاہ و شرمسار۔

خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ ﴿۲۲/۱۱﴾

قرآنِ کریم پر غور و تدبر ہی سے میں نے، اے جوانانِ گرامی قدر! اس ارشادِ خداوندی کو بھی سمجھا کہ جس شخص کو قرآن فہمی کی توفیق عطا ہو جائے، اس پر یہ فریضہ عائد ہو جاتا ہے کہ جو کچھ اس نے سمجھا ہے، اسے دوسروں تک بھی پہنچائے۔ اس ارشادِ خداوندی کی روشنی میں میں نے یہ اپنی ذمہ داری سمجھی کہ ——— دیکھا ہے جو کچھ میں نے، اوروں کو بھی دکھلا دوں۔ چنانچہ میں گذشتہ قریب تیس سال[1] ہی سے، اپنی بساط کے مطابق، اس فریضہ کی ادائیگی میں بھی مصروف چلا آ رہا ہوں۔ میری تصانیف، میرے مقالات، میری تقاریر، سب اسی فریضہ کی ادائیگی کی مختلف شکلیں ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہمیت درسِ قرآن کریم کو حاصل ہے کہ اس میں قرآنی حقائق اس طرح بار بار سامنے آتے ہیں کہ یہ آہستہ آہستہ ذہن کی گذرگاہوں سے آگے بڑھ کر قلب کی گہرائیوں تک میں اُترتے چلے جاتے ہیں۔ میں نے اس سلسلہ کو ۱۹۳۸ء کے قریب کراچی میں شروع کیا تھا۔ یہ وہاں مسلسل جاری رہا تاآنکہ میں ۱۹۵۵ء میں لاہور منتقل ہو کر چلا آیا۔

---

[1] اب پچاس سال۔

اور اس سلسلہ کو یہاں جاری کر دیا۔ ابتدائی دو سال، قرآن کریم کے بنیادی تصورات پیش کرنے میں صرف ہو گئے اور اس کے بعد ۱۹۶۱ء سے، اس کا مسلسل درس شروع کر دیا گیا۔ للہ الحمد کہ سات سال سے زائد عرصہ دراز کی ہفتہ واری نشستوں میں یہ مبارک و مسعود سلسلہ بایں حسن و خوبی، اب تکمیل تک پہنچ گیا ہے اور آج کی یہ تقریب اسی کا جشنِ مسرت ہے۔ میں جب سترہ سال کی ان گزری ہوئی منزلوں پر نگہِ بازگشت ڈالتا ہوں، تو میرا سرِ نیاز بدرگاہِ رب الناس، بصد تسلیم و تکریم جھک جاتا ہے کہ اس نے مجھے اس قدر حوصلہ طلب فرہادیت کے بعد اس جوئے شیر کے لانے کی توفیق عطا فرمائی۔

قرآن فہمی کے سلسلہ میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس میں جو قوانین و احکام اور اصول و اقدار مذکور ہیں۔ وہ محکمات ہیں یعنی ان کا مفہوم متعین ہے۔ لیکن ان کی تائید و شہادت میں جو حقائق بیان ہوئے ہیں۔ وہ تشبیہات و استعارات کے انداز میں سامنے لائے گئے ہیں جنہیں اپنی اپنی اور اپنے زمانے تک کی علمی سطح کے مطابق سمجھا جا سکتا ہے ان حقائق کا تعلق، خارجی کائنات اور انسانی زندگی کے مختلف گوشوں سے ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان حقائق کے ادراک کے لئے، کائنات اور انسانی دنیا سے متعلق مختلف علوم تک دسترس ضروری ہے۔ لیکن یہ بھی واضح ہے کہ کسی ایک فرد کے لئے مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے کہ اُسے ان جملہ علوم پر کامل دستگاہ حاصل ہو۔ اُسے چند ایک علوم پر عبور، اور دیگر علوم کی مبادیات سے واقفیت تو ہو سکتی ہے، وہ جملہ علوم کا احاطہ نہیں کر سکتا — بنابریں قرآنی حقائق کا کما حقہٗ ادراک، ایک فرد کا نہیں، ایک جماعت کا کام ہے۔ لہٰذا کسی فرد کو بھی اس کا دعویٰ نہیں ہو سکتا کہ قرآنی حقائق کے متعلق اس نے سب کچھ سمجھ لیا ہے۔

دوسرے یہ کہ خود علمِ انسانی کی کیفیت یہ ہے کہ جوں جوں حقائقِ کائنات منکشف ہوتے جاتے ہیں، ان علوم کی وسعتوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ جوں جوں علمِ انسانی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، قرآنی حقائق نکھر اور اُبھر سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں خود قرآن کریم نے کہا ہے کہ

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳)

ہم خارجی کائنات اور خود انسانی دنیا میں انہیں اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے۔ تا آنکہ قرآن کا ہر دعوے حقیقت بن کر ان کے سامنے آجائے۔

اس سے واضح ہے کہ جوں جوں انفس و آفاق کے حقائق مستور بے نقاب ہوتے جائیں گے، قرآن کی صداقتیں مشہود ہوتی چلی جائیں گی۔ لہٰذا، انسانی تاریخ کے کسی دور میں بھی یہ نہیں کہا جا سکے گا کہ قرآنی حقائق کے متعلق جو کچھ سمجھا جانا تھا وہ سمجھا جا چکا ہے۔ اس میں نہ اصلاح و ترمیم ہو سکتی ہے نہ حک و اضافہ — جس طرح علوم سائنس کے متعلق ریڈنگ یونیورسٹی کے طبیعات کے پروفیسر ڈاکٹر جیمز آرلڈ نے کہا ہے کہ

دُنیائے سائنس میں کسی موضوع پر حرفِ آخر، آخری انسان کے لئے ہی چھوڑ دینا پڑتا ہے

اسی طرح قرآنی حقائق کے متعلق بھی بجا طور پر کہا جائے گا کہ اس ضمن میں حرفِ آخر، آخری انسان کے حصے ہی میں آسکتا ہے۔

یہ وجہ ہے جو میں نے کبھی یہ دعوے نہیں کیا کہ قرآن کریم کے متعلق جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ حرفِ آخر ہے اور اس میں سہو و خطا کا کوئی دخل نہیں۔ یہ افہام و تفہیمِ قرآنی کی بہرحال ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں اصلاح و ترمیم کی گنجائش ہے۔

میں اسے پھر دہرادوں کہ میں نے جو ابھی عرض کیا ہے کہ قرآنی حقائق کو ہر دور کے انسانی علم کی سطح تک سمجھا جا سکتا ہے، تو یہ اُن حقائق کے متعلق ہے جنہیں قرآن کریم نے اپنے دعاوی کی تائید میں تشبیہات و استعارات کے انداز میں بیان کیا ہے ـــــ جس کتاب کو زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہونا تھا اس کے حقائق کو تشبیہات و استعارات کے انداز ہی میں بیان کیا جا سکتا تھا۔ جہاں تک انسانی زندگی کے لئے راہنمائی کا تعلق ہے، اسے قرآن نے متعین انداز میں بیان کر دیا ہے جس میں نہ ابہام ہے نہ اختلاف۔ وہ نہایت واضح، متعین، اور صاف و سادہ ہے جس سے نہایت آسانی سے مستفید ہوا جا سکتا ہے۔

جہاں تک قوانین کا تعلق ہے، قرآن نے بجز چند احکام باقی قوانین کے لئے صرف اصول دیئے ہیں اور اسے ہر دور کی ملتِ اسلامیہ پر چھوڑا ہے کہ وہ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، باہمی مشاورت سے، جزئی قوانین مرتب کرے۔ یہ اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے اور ان کے حدود کے اندر مرتب کردہ جزئی قوانین زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ یہ قوانین اسلامی مملکت کی طرف سے نافذ ہوں گے۔ اسی کو اسلامی فقہ یا شریعت کہا جاتا ہے۔ قرآنی مملکت میں کسی فرد یا افراد کی کسی جماعت کو حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ فقہی قوانین مرتب یا نافذ کرے۔ یہ صرف اسلامی مملکت کا منصب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں مذہبی پیشوائیت کا تصور ہی نہیں۔ مسلمانوں میں یہ تصور، ان کے دورِ ملوکیت کا پیدا کردہ ہے جب دین نے مذہب کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے بنا دیئے گئے تھے۔

ان غیر متبدل اصولوں کو اقدار (VALUES) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حیوان اور انسان میں امتیازی خط، اقدار (VALUES) کا تصور ہے۔ حیوان صرف اپنی طبیعی ضروریات کا احساس رکھتا ہے۔ وہ اقدار (VALUES) کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔ یہ انسان کی خصوصیت ہے کہ وہ طبیعی ضروریات کا بھی احساس کرتا ہے اور اقدار کا تصور رکھنے کے قابل بھی ہے۔ جب کسی معاشرہ میں اقدار کا تصور گم ہو جائے یا مدھم پڑ جائے، تو وہ معاشرہ انسانوں کی بستی نہیں رہتا، حیوانات کا انبوہ بن کر رہ جاتا ہے۔ جہاں صرف جنگل کے قانون کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے اپنے احکام کی طرح ان اصول و اقدار کو بھی نہایت واضح اور متعین انداز میں بیان کیا ہے تاکہ اس باب میں کسی قسم کا ابہام و اختلاف نہ رہے۔ انہیں ہر شخص جو قرآن کی زبان سے واقف ہو، بادنیٰ غور و تدبر نہایت آسانی سے سمجھ سکتا ہے لیکن قرآن فہمی کے سلسلہ میں، ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جو "پل صراط کے عوامی تصور کے مطابق" بال سے باریک اور تلوار سے تیز" ہوتا ہے کہ وہاں سے اگر پاؤں پھسلے تو انسان سیدھا جہنم کے گڑھوں میں جا گرے۔ وہ نازک ترین مرحلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی خاص نظریہ یا تصور کو ذہن میں لے کر قرآن کی طرف اس لئے آتا ہے کہ اُسے اس سے اپنے نظریہ یا تصور کی تائید مل جائے، تو اُسے قرآن کی بارگاہ سے ایسی پھٹکار پڑتی ہے جو اس کے لئے ہر دو جہان میں وجۂ روسیاہی ہوتی ہے۔ قرآن کو اپنے خیالات کے تابع رکھنا شرکِ عظیم ہے۔ یہ اپنا دروازہ اس کے لئے کھولتا ہے

جو قلب و نگاہ کی پاکیزگی کے ساتھ، خالی الذہن ہو کر، اس کے آستانِ عالیہ پر دستک دے۔ ہمارا قدامت پرست طبقہ، ماڈرن مسلمانوں کو یہ کہہ کر مطعون کرتا ہے کہ یہ مغرب کے نظریات کو ذہن میں رکھ کر قرآن سے ان کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کی اپنی حالت یہ ہے کہ ان کے تمام نظریات و معتقدات کو، جن کی سند صرف اس قدر ہے کہ وہ قوم میں متوارث چلے آ رہے ہیں، ایمان کا درجہ دے کر قرآن کو ان کی تائید میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ اگر ماڈرن طبقہ کا یہ جرم ہے کہ وہ اپنے ذہن میں پہلے سے کچھ تصورات قائم کر کے قرآن کی طرف آتے ہیں، تو ہمارا یہ اسلاف پرست طبقہ اس جرم کا اس سے بھی زیادہ شدت سے مرتکب ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے جو کہا تھا کہ ؎

مکتب و ملّا و اسرارِ کتاب　　　کورِ مادرزاد و نورِ آفتاب

تو اس سے یہی مقصود تھا۔ ماڈرن طبقہ تو پھر بھی کوئی ایک آدھ نظریہ مستعار لے کر قرآن کی طرف آتا ہوگا، یہ حضرات زندگی کے اصولوں سے لے کر چھوٹی چھوٹی جزئیات تک ہر باب میں، متعین معتقدات اپنے ذہن میں رکھتے ہیں جن میں ذرا سی تبدیلی بھی کفر کے مرادف سمجھی جاتی ہے۔ اور پھر دعوے یہ کرتے ہیں کہ ہم قرآن کو سمجھتے ہیں۔ سوچئے کہ جو اس طرح آنکھیں بند کر کے، چلے، اسے سورج کی روشنی کیا فائدہ دے سکتی ہے؟

میں، برادرانِ عزیز! پوری دیانت داری سے عرض کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ میں نے قرآن کریم کو اس طرح سمجھنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ میں اسے شرک سمجھتا ہوں۔ جہاں تک متوارث نظریات کا تعلق ہے انہیں میں نے اُس زمانے میں قرآن کی کسوٹی پہ پرکھنا شروع کر دیا تھا، جب میں قدامت پرستی کے ظلمت کدوں سے عقل و فکر کی وادیوں کی طرف آیا تھا۔ اور جہاں تک عصرِ حاضر کے پیدا کردہ نظریات کا تعلق ہے۔ ان میں سے ایک ایک کو میں نے ہدفِ تنقید بنایا اور قرآن کی روشنی میں پرکھا ہے۔ لہٰذا، میرے فہمِ قرآنی میں، کہیں غیر شعوری طور پر میرے اپنے خیالات کی آمیزش ہوگئی ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔ لیکن میں نے دانستہ کبھی ایسا نہیں کیا۔ یہ اس لئے کہ اس کے لئے میں اپنے آپ کو خدا کے ہاں جواب دِہ سمجھتا ہوں۔ ذمہ داری کا یہی شدید احساس ہے جس سے میری کیفیت یہ ہوتی ہے کہ میں قرآن کے متعلق جب کبھی کچھ کہنے کے لئے لب کشائی کرتا یا کچھ لکھنے کے لئے قلم اٹھاتا ہوں، تو میرا دل لرز جاتا ہے، میری روح پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

یہ کچھ تو عزیزانِ من! میں نے اپنے متعلق کہا۔ آپ احباب جس التزام سے میرے درس میں شریک ہوتے رہے اور جس جذب و انہماک سے اسے سنتے رہے ہیں، وہ قرآن کے ساتھ آپ کی والہانہ وابستگی کی دلیل ہے، اور اس کے لئے آپ مستحق ہزار تبریک و تہنیت ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں وہ بنیادی نکتہ جسے میں اکثر اپنے درس میں بیان کیا کرتا ہوں، اُسے آج پھر دُہرا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ قرآن کی تعلیم صرف نہاں خانۂ ذہن میں محفوظ کر لینے کے لئے نہیں۔ اس کا صحیح مقام، قلبِ انسانی کی گہرائیاں ہیں۔ اس لئے کہ ذہنی سطح پر تیرنے والی تعلیم، ایک قسم کا فکری نشاط تو پیدا کر سکتی ہے، انسان کے قلب و نگاہ میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک انسان کے قلب و نگاہ میں تبدیلی پیدا نہ ہو، جب تک اُس کی اقدار کے پیمانے نہ بدلیں، اس کی سیرت و کردار میں حسن پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے ان

بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ؎

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اور جب اس طرح قلب و نگاہ مسلمان ہو جائے تو پھر، قرآن کے الفاظ میں، یہ زمین بدل جاتی ہے، یہ آسمان بدل جاتا ہے۔ قرآن کریم میں جس طرح آج سے چودہ سو سال پہلے یہ صلاحیت تھی کہ وہ اس جہانِ متعفن کو بدل کر، اس کی جگہ ایک نئی دُنیا وجود میں لے آئے، اس میں آج بھی اس کی صلاحیت بدستور موجود ہے، اس لئے کہ قانونِ کائنات نہ کبھی پُرانا ہوتا ہے، نہ فرسودہ۔ قرآن آج بھی یہ کچھ کرکے دکھا سکتا ہے کہ ؎

گر زمینی، آسماں سازد ترا　　　آنچہ حق میخواہد، آں سازد ترا
خستہ باشی! استوارت می کند　　　پختہ مثلِ کوہسارت می کند
نوعِ انساں را پیامِ آخریں　　　حاملِ اُو رحمۃ للعالمین
اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ　(۱۷/۹)

آخر میں، میں اس سلسلۂ درازکی تکمیل پر ایک بار پھر حضور ربّ العزت سجدہ ریز ہوں کہ اس نے مجھے ان صبر آزما مراحل کو بحسن و خوبی طے کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اور اس کے ساتھ ہی بصد عجز و نیاز عرض پرداز ہوں کہ اس درس میں میں نے جو کچھ قرآن کی منشاء کے مطابق پیش کیا ہے، وہ اسے ثبات و استحکام عطا کرے، اور اگر کوئی بات نادانستہ، منشائے قرآنی کے خلاف کہہ دی گئی ہو، تو اسے محو کر دے۔ اقبالؒ کی ہمنوائی میں میری دعا یہ ہے کہ ؎

گر دلم آئینہ بے جوہر است　　　ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن　　　ایں خیاباں را ز خارم پاک کن!

اور

گر دُرِ اسرارِ قرآں سُفتہ ام　　　با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
در عمل پائندہ تر گرداں مرا　　　آبِ نیسانم گہر گرداں مرا

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

والسّلام علیکم!

درسِ دوم ــــــ آغازِ دورۂ ثانی۔ (مارچ ۱۹۶۶ء) جو اب تک جوئے نور کی طرح رواں بزوال جاری ہے۔

عزیزانِ گرامی قدر! سلام مسنون۔

آپ کو درسِ قرآنِ کریم کے سلسلہ زریں کا آغازِ نو مبارک ہو۔ کس قدر ثریا بخت ہیں وہ محفلیں جن میں خدا کی اس

کتابِ جلیل و عظیم کا تذکرہ جیسا وجہ کشادِ قلب و نگاہ ہو۔ دعا ہے کہ خدا آپ احباب کے اس پاکیزہ ذوق میں برکت عطا فرمائے۔

جیسا کہ میں نے درس کے سابقہ سلسلہ کے اختتام پر عرض کیا تھا، میں قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب العلم ہوں۔ اس سے زیادہ نہ میری کوئی پوزیشن ہے نہ کوئی دعوےٰ۔ میں نے عمر بھر اس کتاب عظیم کو اپنی نگاہوں میں رکھا ہے۔ اور ایسا کہنے میں، میں کسی مبالغہ سے کام نہیں لے رہا۔ قریب پانچ برس کا تھا کہ مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ اس وقت سے آج تک ـــ کہ میری عمر پینسٹھ برس[1] کے قریب ہونے کو آئی ہے ـــ بجز ان دنوں کے جن میں کسی وجہ سے معذور ہی نہ ہو گیا ہوں، شاید ہی کوئی دن ایسا گذرا ہو جب قرآن مجید میرے سامنے کھلا نہ ہو۔ عمر کے پہلے مرحلہ میں، قرآن کا مطالعہ اسی قدیم انداز سے کیا جیسا ہمارے ہاں ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس کے بعد، جب میرے شعور نے آنکھ کھولی تو یہ دیکھا کہ اس طریق سے، جو کچھ قرآن سے سمجھا تھا وہ حقیقت سے بہت دُور تھا۔ اس کے بعد میں نے قرآن کو خود قرآن سے سمجھنے کی کوشش، اور میں از تفخر نہیں، بلکہ بطور تحدیثِ نعمت، یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ قرآن کریم کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کی صداقت پر مجھے علیٰ وجہ البصیرت، قلب و دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ، یقین نہ حاصل ہو۔ فالحمد للہ حمداً کثیرا۔ قرآن حکیم کو اس طرح سمجھ لینے کے بعد، مجھ پر یہ فریضہ عائد ہو گیا کہ ـــ دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دوں۔ چنانچہ قریب تیس[2] سال سے مسلسل، میں قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں، اپنی بساط کے مطابق، مصروف تگ و تاز ہوں۔ میرا ہفتہ واری درس، اسی پروگرام کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس سلسلہ کو میں نے (غالباً) ۱۹۵۳ء میں کراچی میں شروع کیا تھا۔ (اس سے پہلے دہلی اور شملہ میں متفرق خطابات کے ذریعہ اس فریضہ کو سرانجام دیتا رہا)۔ اور یہ سلسلہ بعونہٖ تعالےٰ، آج تک جاری ہے۔ درس کا پہلا سلسلہ، آٹھ سال کے بعد، گذشتہ دسمبر میں تکمیل تک پہنچ گیا تھا۔ اس پر میں نے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ اس گراں بار ذمہ داری سے میں سبکدوش ہو گیا ہوں۔ لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ ؎

مکتبِ عشق کا انداز نرالا دیکھا
اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

اربابِ شوق کے اصرارِ پیہم کے پیشِ نظر، اس سلسلہ کو از سرِ نو شروع کرنا پڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سفر میں کوئی مقام بھی ایسا نہیں آ سکتا جسے آخری منزل کہا جا سکے۔ ان وادیوں میں تو ہاتفِ درا، رہروؤں کو پکار پکار کر کہہ رہی ہوتی ہے کہ ؎

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس سلسلۂ نو کا آغاز ہم بہار کے موسم سے کر رہے ہیں جب حیاتِ تازہ اپنی نمود کے لئے

[1] اب اسی برس

[2] اب پچاس سال

مضطرب و بے قرار ہوتی ہے اور شاخوں کے پردوں میں چھپی ہوئی رعنائیاں، متانہ وار ابھر اور نکھر کر وجہ شادابیٔ عالم بن جاتی ہیں۔ چہ عجب کہ وہ قرآنی حقائق جو سلسلۂ اوّل میں ہماری نگاہوں سے پوشیدہ رہ گئے تھے۔ اس دفعہ بے نقاب ہو کر ہمارے سامنے آجائیں۔

سلسلۂ اوّل میں، میرا انداز زیادہ خطیبانہ تھا لیکن اب میں چاہتا ہوں کہ درس کا اسلوب معلمانہ رکھوں۔ اور قرآن کریم کو ایک نصاب کی کتاب کی طرح آپ احباب کے سامنے پیش کروں۔ یعنی اس کے ایک ایک لفظ کی تشریح کرتے ہوئے متعلقہ آیت کا مفہوم متعین کر دیا جائے اور پھر اس آیت کا ربط دیگر آیات کے ساتھ قائم کرتے ہوئے قدم بقدم آگے بڑھتے چلے جائیں۔ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ (۹۷/۵) میں اس شوقِ بے پایاں اور آرزوئے بیکراں کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ ؎

تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

وَمَا تَوْفِيقِىٓ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ

لفظ قرآن کا مفہوم

لفظ قرآن کا مادہ (ق - ر - ء) ہے۔ عربی زبان میں مادہ کسے کہتے ہیں اور اس کی خصوصیت کیا ہوتی ہے، اس کے متعلق ذرا آگے چل کر عرض کروں گا۔ اس مادہ (ق - ر - ء) کے بنیادی معنی ہوتے ہیں — جمع کرنا اور محفوظ رکھنا — سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "جمع" اور "حفظ" بھی تو عربی زبان کے الفاظ ہیں اور خود قرآن نے انہیں استعمال بھی کیا ہے تو پھر (ق - ر - ء) کے مادہ میں کیا خصوصیت ہے کہ قرآن کا لفظ، اس مادہ سے لیا گیا، جمع اور حفظ سے نہیں۔ قرآن کا ایک اعجاز لفظوں کا انتخاب ہے، اور اس کا یہ انتخاب خود پکار کر کہہ دیتا ہے کہ

ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

(ق - ر - ء) کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو اس طرح جمع اور محفوظ رکھنا جس طرح رحمِ مادر میں نطفہ محفوظ رکھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ رحم میں نطفہ اس طرح محفوظ نہیں رکھا جاتا جس طرح (مثلاً) کسی تھیلی میں چند سکے محفوظ رکھے ہوں۔ وہ سکے، جامد ہوں گے اور ویسے کے ویسے پڑے رہیں گے۔ لیکن رحم میں نطفہ جامد نہیں ہوتا۔ اس میں بڑھنے، پھولنے، پھلنے، نشوونما پانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ قرآن کریم تمام نوعِ انسان کے لئے، قیامت تک ضابطۂ حیات ہے۔ اس لئے اس میں یہ صلاحیت ہوتی چاہیئے (اور ہے) کہ یہ انسانی زندگی کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیتے چلا جائے۔ یہ ہر زمانے میں انسانی فکر کی امامت کا فریضہ سرانجام دے۔ یہ کاروانِ انسانیت کے لئے ہر منزل میں چراغِ راہ ہو۔ یہ کسی مقام پر بھی یہ نہ کہہ دے کہ مجھ میں اب آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں رہی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ خصوصیت اسی ضابطۂ ہدایت کو حاصل ہو سکتی ہے جس کے حقائق میں، علمِ انسانی کی نسبت سے بڑھنے اور پھولنے پھلنے کی صلاحیت ہو۔ یہ حقیقت ہے جسے قرآن نے ان حسین و بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ط (۴۱/۵۳)

ہم نوعِ انسان کو اپنی نشانیاں عالمِ انفس و آفاق میں دکھاتے چلے جائیں گے تا آنکہ یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے وہ حق و صداقت پر مبنی ہے ۔

یعنی جوں جوں انفس و آفاق میں پوشیدہ حقیقتیں بے نقاب ہوتی جائیں گی قرآن کی صداقت اور نکھر اور اُبھر کر سامنے آتی جائے گی ۔ انسانی علم کی ہر تحقیق ۔ سائنس کا ہر انکشاف قرآنی دعاوی کی شہادت بنتا چلا جائے گا ۔ دوسرے مقام پہ اس نے کہا ہے کہ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۔ چونکہ یہ عالمگیر انسانیت کے لئے ضابطۂ ہدایت ہے ۔ اس لئے وَ لَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ۔ (۳۸/۸۸) ۔ اس میں بیان کردہ حقائق سب کے سب ایک ہی وقت میں سامنے نہیں آجائیں گے ۔ یہ کچھ وقت کے بعد بے نقاب ہوں گے ۔

یہ ہے لفظ قرآن کی ، مادہ کے اعتبار سے خصوصیت ۔ بعض ماہرینِ لغت کا خیال ہے کہ یہ لفظ عبرانی ہے اور اس کے معنی ہیں اعلانِ عام (PROCLAMATION) اس اعتبار سے قرآن کے معنی ہوں گے مملکتِ خداوندی کا اعلامیہ ۔ وہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے یہ آیت نازل ہوئی تھی کہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۔ تو اس کے معنی ہوں گے ۔۔ اُٹھ ۔ اور دُنیا میں اس خدا کی عالمگیر ربوبیت کا اعلانِ عام کر دے جس نے کائنات اور انسانوں کو پیدا کیا ہے ۔ اس حقیقت کا اعلان کہ انسانوں کی ربوبیت (پرورش) ، انسانوں کے ہاتھ میں نہیں رہے گی ۔ یہ اس خدا کے نظام کی تحویل میں رہے گی جس نے انسانوں کو پیدا کیا اور ان کی نشوونما کا ذمہ لیا ہے ۔

کیسا انقلاب آفریں ہے خدا کا یہ اعلان!

کتاب خدا نے قرآن کو کتاب بھی کہا ہے ۔ اس لفظ کا مادہ (ک ۔ ت ۔ ب) ہے جس کے معنی حکم دینے یا کسی بات کو واجب قرار دینے کے ہیں ۔ مثلاً قرآن میں ہے كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ ۔ (تم پر روزے فرض قرار دیئے گئے ہیں) ۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ ۔ تم پر (عندالضرورت) جنگ کرنا قانوناً لازم قرار دیا گیا ہے ۔ اس اعتبار سے "کتاب" کے معنی ضابطۂ قانون کے ہوں گے ۔ قرآن کریم نے اس لفظ کو ان معانی میں خود استعمال کیا ہے ۔ مثلاً سورۃ النساء میں پہلے تفصیلاً بتایا گیا ہے کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے کون کون سے رشتے تم پر حرام ہیں ۔ اور اس کے بعد کہا كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (۴/۲۴) تمہارے لئے خدا کا قانون ہے ۔ اسی جہت سے قرآن کے متعلق کہا کہ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (۹۸/۳) اس میں نہایت محکم قوانین ہیں ۔

قوانینِ فطرت اس مقام پر ضمناً ایک نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں ۔ دُنیا میں قوانین (LAWS) دو قسم کے ہوتے ہیں ۔ ایک وہ جنہیں قوانینِ فطرت (LAWS OF NATURE) کہا جاتا ہے ۔ اور دوسرے وہ جن کا تعلق خود انسان کی اپنی ذات اور اس کی تمدنی زندگی سے ہوتا ہے ۔ قوانینِ فطرت کے متعلق ہر صاحبِ علم (سائنٹسٹ) اس کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے نہیں ۔ لیکن جہاں تک دوسری قسم کے قوانین کا تعلق ہے ، مغرب کے سیکولر نظام کی عمارت

اس مفروضہ پر استوار ہوتی ہے کہ انسانوں کو حق حاصل ہے کہ وہ ان قوانین کو خود وضع کریں لیکن قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ انسانوں کے خودساختہ قوانین کے تحت انسانی معاشرہ کو فوز و فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔ ان قوانین کے بنیادی اصول اور مستقل اقدار بھی (قوانینِ فطرت کی طرح) خدا ہی کی طرف سے ملنے چاہئیں۔ یہ اصول واقدار وحی کی رُو سے ملتے ہیں اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ قرآن کریم نے جہاں انسانی زندگی سے متعلق قوانین کو کتاب اللہ سے تعبیر کیا ہے، وہاں اس نے قوانینِ فطرت کے لئے بھی یہی اصطلاح استعمال کی ہے۔ مثلاً سورۂ توبہ میں ہے

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ ..... (۹/۳۶)

یہ حقیقت ہے کہ کتاب اللہ کی رُو سے مہینوں کی تعداد بارہ ہے اور یہ اس زمانے سے مقرر ہے جب خدا نے ارض و سماوات کو پیدا کیا تھا۔ یعنی جتنی مدت میں زمین، سورج کے گرد پورا چکر کاٹتی ہے، وہ ایک سال کا عرصہ ہوتا ہے اور اس کو بارہ پر تقسیم کر کے مہینوں کا شمار کیا جاتا ہے۔ اس تقسیم کی رُو سے ہر سال کا ہر مہینہ سابقہ سال کے اس مہینہ کے مطابق ہوتا ہے۔[1] آپ نے دیکھا کہ یہاں بات ہو رہی تھی قانونِ فطرت کی۔ لیکن اسے تعبیر کیا گیا ہے "کتاب اللہ" سے۔ اس کے بعد ہے مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ۔ ان میں سے چار مہینے ایسے ہیں جن میں جنگ ممنوع قرار دی گئی ہے — یہ قانون، انسانی معاشرہ سے متعلق ہے۔ اس کے بعد ہے ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ (۹/۳۶)۔ یہ خدا کا دینِ قیم ہے۔ یعنی قوانینِ فطرت اور انسانی زندگی سے متعلق قوانین، دونوں کے مجموعہ کا نام دینِ قیم ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ "کتاب اللہ" کے دو حصے ہیں۔ ایک صحیفۂ فطرت، جو خارجی کائنات میں بکھرا پڑا ہے۔ اور دوسرا صحیفۂ وحی، جس کا محفوظ اور مکمل مجموعہ قرآن کریم ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے، یہ دونوں قوانین، خدا کی طرف سے عطا کردہ ہیں اور دونوں کی پابندی ضروری ہے۔ قوانینِ فطرت کی پابندی سے فطرت کی قوتیں مسخر ہو جاتی ہیں۔ اور قوانینِ وحی کی پابندی سے وہ قوتیں انسانی ذات کی نشو و ارتقاء اور عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک ضابطۂ قوانین سے بھی اعراض برتا جائے تو زندگی کا اعتدال قائم نہیں رہتا اور کاروانِ انسانیت منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگر قوانینِ فطرت سے اعراض برتا جائے تو دین، مذہب میں تبدیل ہو کر خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (دنیا میں ذلت و خواری) کا موجب بن جاتا ہے۔ اگر مستقل اقدارِ خداوندی سے اعراض برتا جائے تو دنیا اس جہنم میں گرفتار ہو جاتی ہے جس کے شعلے آج تمام اقوامِ عالم کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہیں۔ اس روشِ زندگی کو قرآن نے "کتاب کے ایک حصے پر ایمان اور دوسرے حصے سے کفر" سے تعبیر کیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ؟ کیا یہ لوگ کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے اور دوسرے حصے سے کفر برتتے ہیں

---

[1] قرآن میں اس کی وضاحت کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی۔ اس کی بابت، متعلقہ مقام پر تفصیل سے بات کی جائے گی۔

فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ (۸۵/۲) جو ایسا کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ دنیا کی زندگی میں ذلت و خواری اس کے حصے میں آئے گی۔ اور قیامت میں وہ شدید ترین عذاب میں مبتلا ہو گا۔ تاریخ انسانیت اس حقیقت پر شاہد ہے کہ تسخیر فطرت اور مستقل اقدار کو جب بھی الگ الگ رکھا گیا، اس کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ نکلا۔ انسانی

کتاب میں تفریق

زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اسے مختلف حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ کتاب میں تفریق کا ایک پہلو تو یہ ہے جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے۔۔۔ یعنی قوانینِ فطرت اور مستقل اقدار میں مغائرت پیدا کرنا۔ دوسرا گوشہ یہ ہے کہ خود قرآن کریم کے ایک حصہ پہ عمل کرنا اور دوسرے سے اعراض برتنا۔ اس کا نتیجہ بھی ذلت و خواری کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ہم نے صدیوں سے یہی روش اختیار کر رکھی ہے اور اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں (مثال کے طور پر دیکھئے) كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ اور كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ دونوں یکساں احکام خداوندی ہیں۔ لیکن ہم كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ پر تو اس شدت سے عمل پیرا ہوتے ہیں لیکن كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ کو اپنی زندگی سے یکسر خارج کر رکھا ہے، حالانکہ مومن کی ساری زندگی مجاہدانہ عسکریت کی زندگی تھی۔ روزوں پہ زور اور عسکری تربیت سے اجتناب! یہ کتاب کے ایک حصے پہ ایمان اور دوسرے حصے سے کفر کے مرادف نہیں تو اور کیا ہے۔

الحاد

اتنا ہی نہیں کہ کتاب کے ایک حصہ پہ عمل اور دوسرے سے مجرمانہ تغافل! قرآن تو یہاں تک بھی کہتا ہے کہ کسی ایک قانون یا صفتِ خداوندی کی پابندی میں اس قدر شدت اختیار کر لینا کہ اس سے دوسرے قوانین یا صفاتِ الٰہیہ نظر انداز ہو جائیں، اس کا نتیجہ بھی خوش گوار نہیں نکل سکتا۔ ایک جگہ اس نے کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا (۴۱/۴۰) جو لوگ ہمارے قوانین میں ایک طرف نکل گئے، ان کی یہ روش ہماری نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ دوسرے مقام پہ ہے: وَذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِهٖ (۷/۱۸۰)۔ جو لوگ صفاتِ خداوندی میں سے کسی ایک صفت کو لے کر اس میں ایک طرف دور تک نکل جائیں، ان سے تم کنارہ کشی اختیار کرو۔ (مثال کے طور پر) یہودی اور ہندو، خدا کی صفتِ عدل میں اس قدر متشدد ہو گئے کہ انہوں نے لغزش خوردہ انسان کے لئے بازآفرینی کا کوئی دروازہ ہی کھلا نہ رہنے دیا۔ دوسری طرف عیسائیت، اس کی صفتِ رحیمیت میں اس قدر متشدد ہو گئی کہ اس نے زندگی سے عمل کو یکسر خارج کر دیا اور ہر بات کو خدا کے رحم اور (GRACE) پر منحصر قرار دے دیا۔ قرآن کی رو سے وہ روش بھی غلط تھی اور یہ بھی غلط۔ صحیح روش وہی ہے جو ان قوانین و صفات کی پابندی میں صحیح تناسب و توازن بدوش ہو۔ اسی کو صراطِ مستقیم کہتے ہیں۔ اسلام، الاسماء الحسنیٰ مختلف صفاتِ خداوندی کو پورا پورا توازن لئے ہوئے اعلیٰ حدِ بشریت اپنے اندر منعکس کرنے اور عملی زندگی میں انہیں معیار قرار دینے کا نام ہے۔

اس وقت میں صرف انہی اشارات پہ اکتفا کرتا ہوں۔ تفصیل اس اجمال کی اپنی اپنی جگہ آپ کے سامنے آتی جائے گی۔

یہ کتاب ہے

قرآن کریم کو کتاب کہنے سے اس حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرانا بھی مقصود تھا

کہ یہ ایک کتاب ہے، اور جس طرح تم کسی کتاب کو پڑھتے ہو اور اُس سے فائدہ اُٹھاتے ہو، اُسی طرح اسے بھی پڑھو اور اس سے مستفید ہو۔ آپ سوچیئے کہ اگر آپ کو کوئی ایسی کتاب دے دی جائے، جس کی زبان سے آپ ناواقف ہوں تو آپ اُس کتاب کو کبھی نہیں پڑھتے۔ حتیٰ کہ اگر اُس کی زبان مشکل ہو تو بھی آپ اس کے دو چار صفحے پڑھ کر الگ رکھ دیتے ہیں، کہ اس کا معیار میری علمی سطح سے اونچا ہے۔ اگر اُس کتاب کا پڑھنا آپ کے لئے ضروری ہے تو آپ اُس کی زبان سیکھتے ہیں اور اپنے اندر اتنی استعداد پیدا کرتے ہیں جس سے وہ کتاب سمجھ میں آجائے، آپ کبھی یہ نہیں کرتے کہ آپ کتاب پڑھتے جائیں، خواہ وہ آپ کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ دُنیا کی کسی کتاب کے ساتھ آپ یہ نہیں کرتے۔ لیکن اس میں ایک استثناء ہے اور وہ ہے قرآن کریم۔ اس کے متعلق یہ عقیدہ وضع کر لیا گیا کہ اس کی زبان آتی ہو یا نہ آتی ہو، اسے پڑھتے رہنا چاہیئے۔ اس سے ثواب حاصل ہوتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ دُنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں کہ جسے اس شدت اور کثرت سے پڑھا جاتا ہو، اور اس کے ساتھ ہی، دُنیا کی کوئی اور کتاب ایسی نہیں جسے بے سمجھے پڑھا جاتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو قرآن سے دُور رکھنے کے لئے۔ یا یوں کہئے کہ قرآن کو ان کی نگاہوں سے اوجھل کرنے کے لئے۔ یہ ایک بڑی گہری سازش تھی۔ جسے تقدیس کا لباس پہنا کر مزیّن بنا دیا گیا۔ یوں قرآن کتاب نہ رہا، جنتر منتر کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ کتاب اور جنتر منتر میں فرق یہ ہوتا ہے کہ کتاب کے الفاظ سمجھ کر پڑھے جاتے ہیں اور جنتر منتر کے الفاظ بلا سمجھے دُہرائے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ قرآن کے الفاظ کے تعویذ لکھے جانے لگے۔ اس کی آیات کے ورد ہونے لگے اور اس کا نام رکھا گیا "اعمالِ قرآنی" اور ایسا کرنے والا کہلانے لگا "عامل"۔ سوچیئے کہ ہم اس کتاب کے ساتھ کیا کر رہے ہیں؟ یاد رکھئے جب تک مسلمان قرآن کو کتاب نہیں سمجھتا وہ اس سے کچھ فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔

مدوّن کتاب

اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کے شروع میں یہ کہہ دیا تھا کہ قرآن ایک کتاب ہے۔ عربوں کے ہاں کتاب کا لفظ اس وقت بولتے تھے جب منتشر اجزاء کی شیرازہ بندی کر کے ان میں لوہے کا کڑا پرو دیا جاتا تھا یا سلائی کر دی جاتی تھی ...... قرآن کو الکتاب کہنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ صحیفۂ مقدسہ رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں ایک مرتب اور مدوّن کتاب کی شکل میں موجود تھا، جس کی شیرازہ بندی بھی ہو چکی تھی۔ سورۂ الطور میں ہے

وَالطُّوۡرِ ۙ وَ کِتٰبٍ مَّسۡطُوۡرٍ ۙ فِیۡ رَقٍّ مَّنۡشُوۡرٍ ۙ (۵۲/۱-۳)

یعنی قرآن سطروں میں لکھی ہوئی کتاب تھی۔ پہلے اسے منتشر اوراق پہ لکھا جاتا تھا اور بعد میں اس کی شیرازہ بندی کی جاتی تھی۔ عربوں کے ہاں ہرن کی کھال چھیل کر اُسے (PARCHMENT) کی شکل میں قرطاس بنا لیتے، اسے رَق کہتے تھے جن تحریروں کو محفوظ رکھنا مقصود ہوتا، انہیں اس پر قلم بند کر لیتے تھے۔ جہاں تک کاتبین وحی کا تعلق ہے، سورۂ عبس میں ہے کہ قرآن کی کتابت بڑے باعزت اور قابلِ اعتماد کاتبوں نے کی تھی (۸۰/۱۵-۱۶)۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ روایات جن میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں قرآن جمع اور مدوّن نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی تدوین بعد میں (منتشر ٹکڑوں، ہڈیوں اور پتّوں) کی مدد سے حضرت

ابوبکر صدیقؓ، یا حضرت عمرؓ یا حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ہوئی تھی۔ وضعی ہیں جنہیں قرآن کی اہمیت اور خصوصیت کو نظروں سے گرانے کے لئے اختراع کیا گیا۔

مکمل و محفوظ

اسی مرتب اور مدوّن کتاب کے متعلق کہہ دیا گیا کہ یہ کتاب مکمل ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۵)۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ خدا نے اسے نازل کیا ہے اور وہ خود اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○ (۱۵/۹) یعنی خدا نے اس کی تصریح فرما دی کہ

(۱) قرآن کریم ایک مرتب کتاب کی شکل میں رسول اللہ کے زمانے میں موجود تھا۔

(۲) یہ ہر طرح سے مکمل بھی ہے اور غیر متبدّل بھی۔

(۳) یہ قیامت تک کے لئے محفوظ رہے گا۔

ختم نبوّت

اس سے آپ، علاوہ دیگر امور، اس حقیقت کو بھی دیکھ لیں کہ قرآن کریم نے ختم نبوّت کی حقیقت کو کس طرح واضح کر دیا ہے۔ جب ایک ایسا ضابطہ حیات، ایسا ہو جو تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک کے لئے مرتب، اور محفوظ شکل میں دے دیا گیا ہو اور اس کے بعد اس میں کوئی تبدیلی بھی نہ کر سکتا ہو، تو ایسی کتاب کی موجودگی میں کسی نبی یا رسول کے آنے کی ضرورت کیا رہ جاتی ہے۔ قرآن کی ابدیت، اکملیت، محفوظیت اور عالمگیریت خود ختم نبوّت کی دلیل ہے۔ قرآن کی نصِ صریح کی رُو سے کوئی نبی یا رسول بغیر کتاب کے نہیں آیا۔ لہٰذا جب خدا کی طرف سے آخری کتاب دی جائے تو اس کا لانے والا خود بخود آخری رسول ہو جائے گا۔

زبان عربی

قرآن کریم کے متعلق کہا گیا ہے بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (۲۶/۱۹۵)۔ اس کتاب کی زبان عربی مبین ہے۔ خود لفظ "عربی" کے معنی بھی فصیح اور واضح کے ہیں۔ اور جب اس کے ساتھ "مبین" کا اضافہ کر دیا جائے تو اس کے واضح نہ ہونے میں شبہ کیا رہ جاتا ہے؟ یہ کتاب واضح ہے اور غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ (۳۹/۲۸)۔ اس میں کوئی پیچ و خم نہیں، ابہام نہیں، التباس نہیں —— صاف، نکھری، سیدھی، واضح، کتاب روشن۔ حتیٰ کہ قرآن کو نُور بھی کہا گیا ہے یعنی خود روشن اور دُنیا کو روشن کرنے والی کتاب۔

یوں تو قرآن کی زبان، عربی کے سوا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ خدا نے اصول یہ بتایا ہے کہ جس قوم کی طرف کوئی رسول بھیجا جاتا ہے، اُس رسول کا پیغام اُسی قوم کی زبان میں ہوتا ہے چونکہ رسول اللہ کے اوّلین مخاطب عرب تھے، اس لئے قرآن انہی کی زبان میں آیا۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مشیت کا پروگرام کچھ ایسا تھا کہ وہ زبان جس میں قرآن نازل ہونا تھا ایسی جامع، عمیق اور وسیع ہو کہ وہ قرآنی حقائق کی متحمل ہو سکے۔ علم الالسنہ کے ماہرین بتاتے ہیں کہ اس باب میں دنیا کی کوئی زبان عربی زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جب حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے (حضرت اسمٰعیلؑ) کو ذبح کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے تو خدا نے انہیں، بیٹے کے حلق پہ چھری چلانے سے روک دیا اور کہا کہ ہم اسے ایک عظیم قربانی کے لئے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ حضرت اسماعیلؑ، حضرت ابراہیمؑ کے بڑے بیٹے تھے اور باپ کی مملکتِ عظیم کا انہی کو وارث

ہونا تھا۔ لیکن حکم یہ دیا گیا کہ انہیں حجاز کی وادیٔ غیرِ ذی زرع میں بسا دیا جائے تاکہ یہ وہاں خانۂ خدا کی تولیت کا فریضہ سرانجام دیں۔ اور مملکتِ شام کی سرداری حضرت اسحاقؑ کو دے دی جائے۔ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت اسحاقؑ کی اولاد (بنی اسرائیل) امورِ جہانبانی میں مصروف رہی۔ اس کے حصے میں شوکتِ سلیمانی اور سطوتِ داؤدی آئی۔ لیکن بنی اسماعیلؑ اسی وادیٔ غیرِ ذی زرع میں نہایت سادہ زندگی بسر کرتے رہے۔ انہوں نے نہ کوئی حکومت قائم کی اور نہ ہی کسی تہذیب و تمدن کی بنا ڈالی۔ یہ ایک ہی کام کرتے رہے یعنی عربی زبان کی تشکیل، تعمیر اور تہذیب۔ انہوں نے اس زبان کو اس مقام پہ پہنچا دیا کہ دُنیا کی کوئی زبان اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔ ڈاکٹر (BUCKE) نے اپنی کتاب (COSMIC CONSCIOUSNESS) میں مشہور مستشرق (MAX MULER) کی تحقیقات کے حوالے سے لکھا ہے جس زمانے میں تمام انڈو یورپین زبانوں میں بنیادی تصورات (ROOT CONCEPTS) کی تعداد ایک سو اکیس تک پہنچی تھی، عربوں کے ہاں صرف اونٹ کے متعلقات میں پانچ ہزار سات سو چوالیس الفاظ موجود تھے۔ اس سے اس زبان کی وسعتوں کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ یہ بڑی سائنٹیفک زبان ہے۔ اس میں ایک مادہ (ROOT) ہوتا ہے جو عام طور پہ تین حرفوں پہ مشتمل ہوتا ہے۔ اس مادے کے معانی میں ایک بنیادی خصوصیت ہوتی ہے جو ان تمام الفاظ میں جھلکتی چلی جاتی ہے جو اس مادے سے مختلف ابواب میں بنائے جاتے ہیں۔ ان مادوں کی تعداد (۲۵۰۰) کے قریب ہے۔ آپ اندازہ کر لیجئے کہ ان مادوں سے جو الفاظ بنائے گئے ہوں گے ان کی تعداد کس قدر ہوگی؟

یہ تھی وہ زبان جس میں قرآن نازل ہوا، چونکہ یہ بڑی سائنٹیفک واقع ہوئی ہے اس لئے اس کا سیکھنا بڑا آسان ہے۔ یہ جو اس زبان کو ہوّا بنا کر رکھ دیا گیا ہے تو یہ بھی ایک سازش ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ عام مسلمان قرآن کو براہِ راست سمجھنے سے رُک جائیں اور یہ خاص طبقے کی اجارہ داری ہے۔ خود قرآن کے متعلق یہ کہہ دیا گیا کہ

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ (۵۴/۱۷)

یہ حقیقت ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے بڑا آسان بنایا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ كِتَابٌ فُصِّلَتْ آيَاتُهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (۴۱/۳) یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات کو نکھار کر الگ الگ کر کے واضح طور پہ بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ قرآن ان لوگوں کے لئے جو علم و بصیرت سے کام لیں ایک واضح ضابطۂ حیات بن گیا۔ یہ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (۱۶/۸۹) ہے۔ یعنی جن امور کا ذکر اس میں کیا گیا ہے انہیں بڑی وضاحت سے کھول کر بیان کیا گیا ہے۔

تصریفِ آیات

قرآن کے نازل کرنے والے خدا نے کہا ہے کہ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (۷۵/۱۹) قرآن کی وضاحت خود ہمارے ذمہ ہے۔ اس کے لئے طریق کیا اختیار کیا گیا ہے، یہ بات غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔ قرآن کا انداز عام کتابوں جیسا نہیں۔ عام کتابوں کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس میں کتاب مختلف ابواب میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔ ہر باب کا ایک خاص موضوع ہوتا ہے اور اس موضوع سے متعلق تعلیم اس باب کے تحت مربوط طور پہ دے دی جاتی ہے۔ قرآن اس طرح کی تصنیف کردہ کتاب نہیں۔ وہ یوں سمجھئے جیسے تیئیس سال میں عطا فرمودہ مختلف خطبات کا مجموعہ ہو۔ اس میں ایک بات ایک مقام پہ آئی ہے

اس کی مزید وضاحت دوسرے مقام پر ہے، تفصیل کسی اور جگہ ہے۔ استثناء کسی اور سورۃ میں، نیز مختلف حقائق کو مختلف واقعات کے ضمن میں بار بار دہرایا گیا ہے، اسے تصریف آیات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی آیات کو پھیر پھیر کر لانا۔ سورۂ انعام میں ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ (۶/۱۰۶)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن میں مختلف آیات کو پھیر پھیر کر اس لئے لایا گیا ہے کہ بات اس طرح واضح ہو جاتی ہے جیسے چھلکا اور مغز الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اور یوں بات نکھر اور ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے دو بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے۔

(۱) محاورۂ عرب۔ یعنی نزولِ قرآن کے زمانے میں عربی زبان کے اُن الفاظ کا جو قرآن میں استعمال ہوئے ہیں جو مفہوم عرب لیتے تھے۔ اس سے واقفیت اور

(۲) قرآن پر اتنا عبور کہ جو بات کسی ایک آیت میں کہی گئی ہے، یہ چیز بیک وقت آپ کے سامنے آجائے کہ اس کے متعلق قرآن کے دیگر مقامات میں کیا آیا ہے۔

تدبر فی القرآن

لیکن ان دونوں شرطوں سے زیادہ اہم ایک اور شرط بھی ہے اور وہ ہے تدبر فی القرآن (۴/۸۲)۔ یعنی قرآن کو سمجھنے میں غور و فکر سے کام لینا۔ آپ قرآن کریم کے ورق اُلٹیے۔ قریب قریب ہر صفحے پر آپ کو علم و بصیرت اور عقل و شعور سے کام لینے اور غور و فکر کرنے کی تاکید ملے گی۔ تدبر کا حکم نہ کسی خاص فرد کے لئے ہے نہ کسی خاص زمانے کے لئے۔ وہ تمام افراد کے لئے ہے اور تمام زمانوں کے لئے۔ اس لئے قرآن کو تقلیداً سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ نہ ہی کسی ایک فرد کا تدبر و تفکر دوسرے کے لئے مستند اور حجت ہو سکتا ہے۔ قرآن پر غور کرنے والے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے زمانے میں جس سطح تک علم انسانی پہنچ چکا ہے، اس پر اس کی نگاہ ہو۔ قرآن انسانی زندگی کے تقاضوں کا حل پیش کرتا ہے۔ اگر کسی کو یہی معلوم نہ ہو کہ اس کے زمانے کے انسانی تقاضے کیا ہیں تو وہ قرآن سے راہ نمائی کیا حاصل کر سکے گا؟ اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ جس طرح ایک فرد کا تدبر فی القرآن دوسرے کے لئے مستند اور حجت نہیں ہو سکتا، اسی طرح جو کچھ قرآن کے متعلق کسی ایک زمانے میں سمجھا گیا ہو وہ بھی حرفِ آخر نہیں ہو سکتا۔ جوں جوں علم انسانی بڑھتا جائے گا، نئے نئے قرآنی حقائق واضح ہوتے چلے جائیں گے۔

قرآن میں کوئی اختلافی بات نہیں

قرآن میں ہے۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ (۴/۸۲)۔ کیا ان لوگوں نے قرآن میں تدبر نہیں کیا۔ اگر یہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ لوگ اس میں کئی اختلاف پاتے۔ یعنی قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کہیں اختلاف نہیں۔ اور یہ چیز اس کے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قرآن کے الفاظ میں تو کوئی اختلاف نہیں لیکن اس کی تعبیرات (INTERPRETATIONS) مختلف ہو سکتی ہیں۔ آپ سوچئے کہ لفظی اختلافات کا نہ ہونا بھی کوئی ایسی خصوصیت ہے جس کا اس تحدی سے ذکر

کیا جاتا؟ ساری بات تو تعبیرات کی ہے۔ اگر کسی کتاب کی عبارت کی کیفیت یہ ہو کہ وہ زید کو کوئی مفہوم دے اور بکر کو اس سے بالکل متضاد مفہوم، تو کیا اہل علم کے نزدیک اس کتاب کی کوئی وقعت ہو سکتی ہے؟ — قرآن سمجھنے کے لئے جو شرائط قرآن نے مقرر کی ہیں، اگر اُن کے مطابق قرآن میں تدبّر کیا جائے تو اس کے کسی حکم کی دو تعبیریں ہو ہی نہیں سکتیں۔

اس مقام پر ایک نکتے کی وضاحت ضروری ہے۔ قرآن کریم میں کچھ تو احکام و قوانین دیئے گئے ہیں اور کچھ حقائق — احکام و قوانین کے لئے ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن کے معانی متعین اور ٹھوس (CONCRETE) ہیں۔ لیکن حقائق — بالخصوص وہ حقائق جن کا تعلق مابعد الطبیعیات سے ہے — انہیں تشبیہات کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اور اہل علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ تشبیہات و استعارات سے ہر شخص اپنے اپنے فہم اور علمی سطح کے مطابق مشبہ بہ کے متعلق تصور قائم کر سکتا ہے۔ ان تصورات میں اختلاف ہوگا۔ لیکن جہاں تک قرآنی ہدایات کا تعلق ہے ان کی دو تعبیریں نہیں ہو سکتیں۔ یہ احکام و قوانین اسلامی نظام کی طرف سے نافذ ہوں گے، اس لئے ان کی عملی جزئیات میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ یوں اُمت میں وحدت فی الاصل پیدا ہو جائے گی، اور قرآنی حقائق سمجھنے کے لئے فکری آزادی بھی برقرار رہے گی۔

تطہیرِ فکر و نظر

لیکن ان تمام شرائط سے کہیں زیادہ گہری شرط ایک اور ہے اور وہ یہ کہ جب تک اپنے ذہن کو پہلے سے قائم شدہ نظریات، معتقدات اور تصوّرات سے پاک نہیں کر لیا جائے گا، قرآن سمجھ میں نہیں آسکے گا۔ لَّا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ (۵۶/۷۹) قرآن کا واضح ارشاد ہے۔ یعنی جن کے قلب و نگاہ، انسانی خیالات کی آمیزشوں سے پاک نہ ہوں انہیں قرآن سے کوئی مس نہیں ہو سکتا۔ انسانی قلب خدا کا مسکن بن نہیں سکتا جب تک اس حریم کعبہ سے انسانی فکر کے تراشیدہ بُتوں کو نکال باہر نہ کیا جائے۔ جو شخص پہلے سے کوئی خیال قائم کر کے قرآن کی طرف اس لئے آتا ہے کہ اُسے اپنے اس خیال کی (کسی نہ کسی طرح) تائید مل جائے، اُسے قرآن کی بارگاہ سے بُری طرح پھٹکار پڑتی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں —

بیاں میں نکتۂ توحید آتو سکتا ہے
ترے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہئے

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ اہل عرب کی زبان تو عربی ہے، وہ بھی قرآن کو صحیح طور پر کیوں نہیں سمجھ پاتے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بھی قرآن کو (غیر عرب مسلمانوں کی طرح) تقلیداً سمجھتے ہیں۔ یعنی کسی زمانے میں کسی مفسّر نے جس طرح قرآن کو سمجھا، وہ آنے والوں کے لئے سند اور حجّت بن گیا۔ اس کے بعد یہ سوال ہی نہ رہا کہ قرآن میں خود غور و فکر کیا جائے۔ یہ تقلیدی قرآن، عربوں کو عربی زبان میں پڑھایا جاتا ہے اور غیر عربوں کو ترجموں کے ذریعے اُن کی اپنی زبان میں۔ اپنی فکر سے نہ یہ قرآن کو سمجھتے ہیں نہ وہ — اس لئے اس باب میں عرب اور عجم کی کوئی تفریق ہی نہیں رہی۔ تفسیر کی جو کتابیں الازہر میں پڑھائی جاتی ہیں وہی دیوبند (یا اب کراچی ملتان اور لاہور کے دارالعلوموں) میں زیر تدریس رہتی ہیں۔ اپنی فکر و بصیرت نہ یہاں ہے نہ وہاں۔ قرآن

سمجھنے کے سوال اہلِ زبان ہونے کا نہیں۔ سوال زبان دانی کے بعد اہلِ فکر و نظر ہونے کا ہے۔

(۱)

احادیث کی رو سے قرآن فہمی

کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن کریم کو احادیث کی مدد کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا کیونکہ رسول اللہؐ قرآن کے بہترین اور اعلیٰ ترین مفسّر تھے۔ (بنظرِ ظاہر) یہ بات بڑی معقول دکھائی دیتی ہے۔ اس لئے کہ جب کسی آیت کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ رسول اللہؐ نے اس کی تفسیر یہ بیان فرمائی تھی تو وہ کون سا مسلمان ہے جو اس بات کو زبان تک لانا تو ایک طرف، اس کا تصور تک بھی کر سکتا ہو کہ اس کی تفسیر رسول اللہؐ کی بیان فرمودہ تفسیر سے بہتر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ رسول اللہؐ کی بیان فرمودہ تفسیرِ قرآنی کہیں موجود بھی ہے؟ احادیث کی کتابوں میں ایک باب تفسیرِ قرآن کا بھی ہوتا ہے لیکن اس میں مختلف سورتوں کی دو دو چار چار آیتوں کی تفسیر ہوتی ہے اس سے زیادہ نہیں۔ ان احادیث کے متعلق امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ احادیث کی کتابوں میں تین قسم کی روایات قابلِ اعتماد نہیں —— پیش گوئیوں سے متعلق، لڑائیوں سے متعلق، تفسیر سے متعلق۔ اُن کے اس قول کی تصدیق خود اس تفسیر سے ہو جاتی ہے جسے کتبِ روایات میں رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ مثلاً صحیح بخاری میں سورۂ بقرہ کی تفسیر کی ابتداء اس آیت سے ہوتی ہے، وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ۝ (اللہ نے آدم کو اشیاء کائنات کا علم عطا کر دیا) اور اس کی تفسیر حسبِ ذیل ہے:۔

> حضرت انس ابن مالکؓ۔ رسول خدا صلّی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ قیامت کے دن سب مسلمان جمع ہو کر مشورہ کریں گے کہ آج کے دن ہم کسی کو اپنا شفیع بنائیں اور آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور کہیں گے کہ آپ سب کے باپ ہیں آپ کو اللہ نے ملائکہ سے سجدہ کرایا ہے اور آپ کو تمام نام سکھائے ہیں آپ ہماری شفاعت کریں تاکہ ہم آج اس تکلیف سے راحت پائیں وہ کہیں گے آج میں اس قابل نہیں اور اپنا گناہ یاد کریں گے (خلافِ حکم درخت کا پھل کھا لیا تھا) اور اللہ سے شرمائیں گے اور کہیں گے تم نوحؑ کے پاس جاؤ ان کو اللہ نے سب سے پہلا نبی بنا کر زمین پر بھیجا تھا۔ سب آدمی ان کے پاس آئیں گے وہ کہیں گے آج میں اس قابل نہیں اور اپنا گناہ یاد کر کے شرمائیں گے اور کہیں گے تم ابراہیم خلیل اللہ کے پاس جاؤ سب کے سب ان کے پاس آئیں گے یہ بھی ایسے ہی کہیں گے اور کہیں گے تم موسیٰؑ کے پاس جاؤ اللہ نے ان سے باتیں کی ہیں اور توریت عطا فرمائی ہے وہ ان کے پاس آئیں گے یہ بھی کہیں گے میں آج کے دن تمہارا شفیع نہیں ہو سکتا اور اپنا گناہ یاد کر کے اللہ سے شرمائیں گے اور کہیں گے تم عیسیٰؑ کے پاس جاؤ وہ رسول اللہ اور کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں جب ان کے پاس آئیں گے یہ بھی ایسے ہی کہہ دیں گے اور کہیں گے محمدؐ کے پاس جاؤ جن کے اللہ نے اگلے پچھلے سارے گناہ بخش دیئے ہیں وہ اس وقت میرے پاس آئیں گے میں ان کو اللہ کے پاس بخشوانے لے جاؤں گا اور اللہ کے حضور میں (داخلہ کی) اجازت طلب کروں گا تو مجھ کو (آنے کی)

اجازت ملے گی تو جس وقت میں اپنے رب کو دیکھوں گا تو سجدے میں گر پڑوں گا اور اللہ جو بات میرے دل میں ڈالے گا وہ کہوں گا پھر (اللہ کی طرف سے) کہا جائے گا (اے محمدؐ) سر کو اٹھاؤ سوال کرو تاکہ عطا کیا جائے اور کہو تیرا سنا جائے گا اور شفاعت کرو قبول کی جائے گی۔ اُس وقت میں سر اٹھاؤں گا اور جیسے اللہ نے مجھے تعلیم دی تھی ویسے ہی اس کی تعریف بجا لاؤں گا۔ پھر شفاعت کروں گا اس دفعہ ایک گروہ بخشا جائے گا۔ (یعنی مہاجرین اور انصار اور بڑے بڑے نیک بندے اولیاء اللہ، شہداء) اور ان کو جنت میں بھجوا دوں گا۔ پھر اللہ کی طرف آؤں گا اور دیکھ کر سجدے میں جاؤں گا اور شفاعت کروں گا۔ اس مرتبہ بھی ایک گروہ بخشا جائے گا۔ اسی طرح تیسری دفعہ پھر چوتھی دفعہ ایسے ہی شفاعت کروں گا۔ پھر اللہ کہوں گا کہ کوئی باقی نہیں رہا سوائے ان کے جن کو قرآن نے روکا ہے اور ان پر ہمیشہ کے لئے دوزخ میں رہنے کا حکم ہے۔ ابو عبداللہ بخاری کہتے ہیں یعنی جن کے بارے میں یہ آیت (خَالِدِیْنَ فِیْھَا) ہے۔

آپ غور کیجئے کہ کیا اس تفسیر سے متعلقہ آیت کا کچھ مفہوم بھی سمجھ میں آتا ہے؟ یا اس کا اُس سے کچھ بھی تعلق یا ربط ہے؟

کتبِ احادیث میں بیان کردہ تفسیر کا عام انداز یہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ رسول اللہؐ کی انتہائی دُور اندیشی اور بالغ نظری تھی کہ حضورؐ نے اپنی احادیث کو خود مرتب کرا کر اُمت کو نہ دیا۔ حضورؐ بے شک اعلم الناس تھے لیکن آپؐ نے جو کچھ اپنے اوّلیں مخاطبوں کو سمجھایا ہوگا وہ تو بہر حال اُس زمانے کی علمی سطح کے مطابق ہی ہوگا۔ اگر حضورؐ ان باتوں کو محفوظ کر کے اُمت کو دے دیتے تو بعد میں آنے والے تدبّر فی القرآن کا دروازہ بند ہو جاتا۔ اب جن باتوں کو احادیثِ رسول اللہؐ کہا جاتا ہے وہ درحقیقت وہ باتیں ہیں جنہیں حضورؐ کی وفات کے دو تین سو سال بعد، بغیر کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کے، لوگوں سے سُن کر انفرادی طور پر جمع کیا گیا۔ یہ روایات منسوب الی الرسولؐ کہلا سکتی ہیں، احادیثِ رسول اللہؐ نہیں کہلا سکتیں۔ کیا معلوم ان میں کتنا کچھ حضورؐ کا اپنا ہے اور کتنا کچھ دوسروں کا ملایا ہوا ہے۔ احادیث کے مجموعوں کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ ان میں جو باتیں قرآن کے مطابق ہیں اُنہیں ہم صحیح تسلیم کر سکتے ہیں لیکن جو قرآن کے خلاف ہوں، یا جن سے حضورؐ کی ذاتِ گرامی پر کسی قسم کا طعن پڑتا ہو، اُن کے متعلق ہم کہہ دیں گے کہ وہ رسول اللہؐ کی نہیں ہو سکتیں۔ پھر سُن لیجئے کہ میں رسول اللہؐ کی کسی حدیث کا انکار نہیں کرتا۔ مذکورہ صدر معیار کی رُو سے، غلط روایات کے متعلق کہتا یہ ہوں کہ وہ رسول اللہؐ کی ہو نہیں سکتیں۔

شانِ نزول

ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ جب تک قرآن کی آیات کا شانِ نزول معلوم نہ ہو، قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا۔ شانِ نزول سے مراد یہ ہوتی ہے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں کوئی واقعہ رونما ہوتا تھا اور اُس سے متعلق قرآن کی کوئی آیت نازل ہو جاتی تھی۔ اوّل تو آپ دیکھئے کہ یہ تصور ہی قرآن کی ابدیت اور عالمگیریت کے منافی ہے۔ قرآن قیامت تک کے لئے، اور تمام نوعِ انسان کے لئے، ضابطۂ ہدایت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عالمگیر انسانیت کا کوئی تقاضا ایسا نہیں جس کے متعلق اس میں راہنمائی نہ دی گئی ہو۔ لیکن اگر اس کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ اس میں انہی واقعات کے متعلق ہدایت دی گئی ہے جو رسول اللہؐ کے زمانے میں اتفاقاً رونما ہو گئے تھے تو قرآن ایک مکمل ضابطۂ ہدایت کیسے ہو جائے گا؟ اس میں ان امور کے متعلق ہدایت مل نہیں سکے گی جو حضورؐ کے زمانے میں رونما

نہیں ہوئے تھے۔ نیز اس سے یہ بات بھی لازم آئے گی کہ اگر رسول اللہ دس بیس برس اور زندہ رہتے تو اس عرصہ میں کچھ اور واقعات رونما ہوتے۔ اس صورت میں موجودہ قرآن میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ لہٰذا موجودہ قرآن کو (معاذ اللہ) ناقص بھی تصور کرنا پڑے گا۔ بنا بریں یہ تصور بنیادی طور پر غلط ہے کہ قرآنی احکام صرف اُن واقعات کے سلسلہ میں نازل ہوئے تھے جو رسول اللہ کے زمانے میں ظہور پذیر ہوئے تھے۔ اور جب تک ان واقعات کا علم نہ ہو قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا۔

یہ تو شانِ نزول کے عقیدہ کے متعلق اصولی بحث تھی۔ اب یہ بھی دیکھئے کہ شانِ نزول کی روایات کس قسم کی ہیں۔ سورۂ حجر میں ہے۔

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ ۝ وَإِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۚ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ۝ (۱۵/۲۴-۲۵)

آیت کا مفہوم واضح ہے کہ جو لوگ دُنیا سے پہلے گذر چکے ہیں خدا انہیں بھی جانتا ہے۔ جو بعد میں جانے والے ہیں وہ اُن سے بھی باخبر ہے۔ خدا اُن سب کو اکٹھا کرے گا۔ اس مضمون کی کئی اور آیات قرآن میں موجود ہیں۔ اب یہ دیکھئے کہ کتبِ احادیث کی رُو سے اس آیت کی شانِ نزول کیا بیان کی گئی ہے۔ جامع ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت درج کی گئی ہے کہ

> ایک حسین ترین عورت (مسجد میں) رسول اللہؐ کے پیچھے نماز پڑھنے آیا کرتی تھی۔ صحابہؓ میں سے کچھ لوگ تو آگے کی صف میں بڑھ جاتے تھے تاکہ اسے نہ دیکھیں لیکن کچھ لوگ پیچھے کی صف میں شریک ہوتے تھے اور رکوع کی حالت میں بغل کے نیچے سے اسے جھانکتے رہتے تھے۔ اس پر اللہ نے یہ آیت اُتاری کہ ہم تم میں سے اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور پچھلوں کو بھی۔

یہ روایت کسی تبصرہ کی محتاج نہیں۔ میں نے اسے مثال کے طور پر اس لئے بیان کیا ہے کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ کتبِ احادیث میں شانِ نزول کی روایات کس قسم کی ہیں۔

ان تصریحات سے میرا مطلب یہ نہیں کہ جو کچھ ہمارے پاس اسلاف کا سرمایہ چلا آ رہا ہے، اسے دریا بُرد کر دینا چاہئے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے اُسے لینا چاہئے جو قرآن کے مطابق ہو ——— جو چیزیں قرآن کے خلاف ہوں اُنہیں ہمارے فہمِ قرآنی کے راستے میں روک بن کر کھڑا نہیں ہو جانا چاہئے۔ ہمارے فہم کی آزادی اور پابندی کی حدود قرآن متعین کرتا ہے اور اُسی کو سند اور حجّت ہونے کا حق حاصل ہے۔

(۴)

یہ ہے برادرانِ عزیز! وہ طریقہ جس سے میں نے قرآن سمجھا ہے اور اسی کے مطابق میں دوسروں کو بھی قرآن سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرے درس کا یہی انداز رہا ہے اور اب بھی یہی انداز رہے گا۔ جو اربابِ ذوق اس طرح قرآن سمجھنا چاہیں وہ میرے درس سے مستفید ہو سکیں گے۔ لیکن جو اصولی طور پر اس طریق سے متفق نہ ہوں، انہیں اس درس سے ذہنی کش مکش اور قلبی ہیجان کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے، قرآن سے وہی فیض یاب ہو سکتا ہے۔ جو پہلے سے قائم شدہ نظریات و معتقدات کو الگ کر کے اس کی بارگاہ میں آئے۔ اگر درس میں بیان کردہ امور میں سے کوئی بات وضاحت طلب ہو تو اُس کے متعلق آپ ہفتہ کے

مجھے مطلع کر دیں۔ میں آئندہ درس میں اُس کی مزید وضاحت کر دیا کروں گا۔ لیکن یہ چیز وضاحت طلبی کے لئے ہو، بحث و مناظرہ کی خاطر نہیں۔ ان باتوں کے لئے نہ میرے پاس وقت ہوتا ہے، نہ میں انہیں مفید ہی سمجھتا ہوں اسی لئے اس کی یہاں اجازت نہیں دی جاتی۔ میں نے ان امور کی وضاحت اس لئے بھی ضروری سمجھی ہے کہ جو حضرات آج پہلی بار تشریف لائے ہیں، اُنہیں معلوم ہو جائے کہ یہاں درس قرآن کا انداز کیا ہوتا ہے، اور اس میں شرکت کے آداب کیا ہیں؟

میں آخر میں دعاء کرتا ہوں کہ خدا ہمیں اپنی کتاب عظیم کے سمجھنے اور سمجھانے کے بعد اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ

قارئین اس ایک درس سے اندازہ لگالیں کہ پرویز صاحب کا ہفتہ واری درس کس قسم کا ہوتا ہے۔ لاہور میں یہ درس ہر جمعہ کی صبح (آج کل ساڑھے نو بجے) بی/۲۵ - گلبرگ ۲ میں ہوتا ہے۔ اور دیگر مقامات پر ٹیپ کے ذریعے۔ ان مقامات پر درس کا اعلان، ماہنامہ طلوع اسلام کی قریب قریب ہر اشاعت میں ہوتا رہتا ہے۔ طلوع اسلام

مطالب الفرقان کی پانچویں جلد

حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں سورۃ الانعام مکمل اور سورۃ الاعراف کی آیات (تا ۱۵۸) آگئی ہیں۔ جو بیشتر مشتمل ہیں سابقہ حضرات انبیاء کرام کے کوائف حیات اور اقوام گذشتہ کی عبرت آموز داستانوں پر۔ جو احباب مطالب الفرقان کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اس سلسلۂ تفسیر سے قرآنی حقائق و معارف کن تابانیوں سے واشگاف ہوتے ہیں۔ اس نے قرآن فہمی کا نیا باب کھول دیا ہے

پانچویں جلد بھی ادارۂ طلوع اسلام کے روایتی معیار کے مطابق کاغذ، طباعت اور تجلید کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ قیمت فی جلد - /۷۵ روپے (محصول ڈاک - /۶)

اس سلسلہ کی بقایا جلدوں کی قیمتیں حسب ذیل ہیں:-

جلد اول - /۶۰ روپے، جلد دوم - /۷۵ روپے، جلد سوم - /۷۵ روپے، جلد چہارم - /۹۰ روپے

سلیم کے نام خطوط کی جلدوں کی قیمتیں:-

جلد اول - /۲۵ روپے، جلد دوم - /۲۵ روپے، جلد سوم - /۲۵ روپے

(۱) ادارہ طلوع اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲۔ لاہور ۹ (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار۔ لاہور

(بقیہ بھولی کہانیاں ۔ صفحہ ۲۴ سے آگے)

بھی اگر ایک مرتبہ تھوڑا سا تجربہ کر کے دیکھ لیں گے تو اگلی اور پچھلی سب تلخیاں بھول جائیں گے۔ اور بہت مطمئن رہیں گے بلکہ فخر کریں گے کہ ہم سب پاکستانیوں نے مل کر عام ہیجان اور اضطراب کے زمانہ میں انسانیتِ عامہ کی اس قدر عظیم الشان خدمت انجام دی۔

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ

اب بڑا اہم کام ہمارے سامنے یہ ہے کہ دستور سازی کی مہم ایسے قابل فہیم مضبوط اور محتاط ہاتھوں کے سپرد ہو جو اس ریزولیوشن کے خاص خاص نکتوں کی حفاظت کر سکیں اس کے فحوا کو بخوبی سمجھ سکیں اور جو دستور تیار کیا جائے وہ صحیح لائن سے ہٹنے نہ پائے۔ یہ بہت کٹھن مرحلہ ہے جو اللہ ہی کی توفیق سے آسان ہوگا۔ بہرحال ہم آئندہ کام کرتے ہیں ہر قدم پر اس چیز کے منتظر رہیں گے۔

وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيْقُ ؕ

(بشکریہ چٹان بابت ۱۳-۲۰ دسمبر ۱۹۸۲ء)

قرآنی فیصلے

قرآنی فکر و تعلیم سے شغف رکھنے والوں کا مطالبہ تھا کہ ——— پرویز صاحب کی تصانیف بلند پایہ قرآنی حقائق و معارف کی حامل ہوتی ہیں، اور ان کا اسلوب بیان بھی عالمانہ اور حکیمانہ ہوتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ زندگی کے روزمرہ کے عملی معاملات سے متعلق قرآنی فیصلے عام فہم انداز میں بیان کئے جائیں۔ طلوع اسلام میں یہ انداز اختیار کیا گیا تو یہ ایسا مقبول ہوا کہ کچھ عرصہ کے بعد اسے کتابی شکل میں شائع کرنا پڑا۔ اس سلسلہ کا عنوان تھا۔ ہماری بصیرت کے مطابق

قرآنی فیصلے

اس موضوع کی افادیت نے اس قدر وسعت اختیار کی کہ گذشتہ چند سالوں میں اس کی چار جلدیں شائع کی گئیں۔ انہیں اسلامی انسائیکلوپیڈیا کہئے۔ اب

قرآنی فیصلے ——— جلد پنجم

بھی شائع ہو گئی ہے۔ اس میں بھی حسب سابق اسلام کے نہایت اہم موضوعات آگئے ہیں۔ ضخامت ۵۱۲ صفحات ۔ بکس بورڈ کی جلد۔ قیمت فی جلد بیس روپے -/۲۰
باقی چار جلدوں کی قیمت حسب ذیل ہے :
جلد اول -/۱۰ ، جلد دوم -/۱۰ ، جلد سوم -/۱۰ ، جلد چہارم -/۱۵ ۔ مکمل سیٹ کی قیمت -/۶۵ روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ لاہور